جامعہ حقانیہ کا ترجمان

ساہیوال
سرگودھا

مجلہ الحقانیہ

شعبان رمضان شوال ۱۴۳۵ھ جولائی اگست ۲۰۱۴ء



بانی: فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی قدس سرہٗ

فہرست

علوم عربیہ کی ضرورت واہمیت.................... مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم 3
درس حدیث.............................. حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ 13
ملفوظات حکیم الامت رحمہ اللہ.................. حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ 15
ماہ رمضان المبارک کے فضائل واحکام............ حضرت مولانا مفتی سید عبدالکریم گمتھلوی 17
فضائل ومسائل اعتکاف...................... مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم 24
احکام عید الفطر وصدقۃ الفطر.................... حضرت مولانا مفتی سید عبدالکریم گمتھلوی 34
قتل مسلم.................................. شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ 40
مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی تفسیر علماء عصر کی نظر میں.. فقیہ العصر مفتی سید عبدالشکور ترمذی قدس سرہ 48
ہندوستان کا ایک یادگار سفر...................... حضرت مولانا مفتی شیر محمد علوی مدظلہم 127
اخبار الجامعہ................................ مولانا محمد آصف چنیوٹی 139
تعارف کتب................................. ع۔ن۔ت 141

خط وکتابت کیلئے: دفتر ماہنامہ الحقانیہ جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

web-www.alhaqqania.org

E-mail-alhaqqania@yahoo.com

048-6786002/6786899

پبلشر: مفتی سید عبدالقدوس ترمذی پرنٹر: جناب محمد منیر صاحب فائٹر پرنٹنگ پریس سرگودھا

کمپوزر: جناب حافظ سید عبدالغفور صاحب ترمذی

نوٹ: رسالہ کے متعلق معلومات کے لیے رابطہ نمبر: 0301-4843429

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں رابطہ نمبر: 0301-0331-6769897

کلمۃ الحق

مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم

علوم عربیہ کی ضرورت واہمیت

تعلیم انسان کے لیے انتہائی ضروری اوراہم ہے اس میں کسی کوکلام نہیں ، سب عقلاء کااس پراتفاق ہے۔پھر بحیثیت مسلمان یہ بھی سب کوتسلیم ہے کہ قرآن وسنت کاعلم حاصل کرنامسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہے ،علم دین کاایک درجہ فرض عین ہے جس کا حاصل کرناسب کے لیےضروری ہے جبکہ پورے دین کی تعلیم حاصل کرناہرایک کے لیے فرض نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے، ہربستی میں اگرایک عالم موجودہوجووہاں کے رہنے والوں کی دینی ضروریات میں ان کی رہنمائی کرسکتاہوتویہ کافی ہے ،البتہ بنیادی تعلیم کاحاصل کرنا ہرایک کے لیےضروری ہوگا۔

اس تفصیل سے دینی تعلیم کی اہمیت واضح ہے اوریہ ظاہرہے کہ دینی تعلیم کااصل سرچشمہ اورمأخذقرآن کریم اورسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔اوران دونوں کی زبان عربی ہے،ان سے براہ راست مستفید ہونے کے لیےضروری ہے کہ عربی زبان سے نہ صرف یہ کہ واقفیت بلکہ اس میں ایک گونامہارت ہواس کے بغیراصل سرچشمہ سے براہ راست مستفید ہوناناممکن ہوگا،عربی علوم میں پوری مہارت صرف ونحومنطق وغیرہ حاصل کیے بغیر نہیں ہوسکتی،صرف اردوتراجم پڑھنے اوردیکھنے سے یہ مقصدحاصل نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیےعلوم عربیہ کومحنت اورکوشش سے سمجھ کرپڑھناضروری ہوگا۔محض سرسری طورپرعربی زبان کاپڑھ لینایاترجمہ دیکھ لیناکافی نہ ہوگا۔

بہت سے مقامات پرعربی زبان کے علاوہ عربی علوم کی ضرورت ہوگی ، ان کے بغیرقرآنی آیات کامطلب سمجھ میں نہیں آئے گا۔

حکیم الامت مجددالملت حضرت مولاناشاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے اس

موضوع پر اپنے ایک وعظ ''تعميم التعليم '' میں اس پر بڑا جامع کلام فرمایا ہے۔ ذیل میں اسے نقل کیا جاتا ہے، جس سے یہ حقیقت خوب واضح ہوجاتی ہے۔ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں:

''قرآن وحدیث کی پوری سمجھ عربی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی یہ کہے کہ ہم ترجمے دیکھ کر سب سمجھ لیں گے، سو یاد رکھو کہ ترجموں سے کلام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ علم ذوق کا نام ہے اور ذوق جبھی حاصل ہوگا جبکہ قرآن وحدیث کی زبان میں اس کو پڑھا جائے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اہل علم کو جو لطف قرآن میں آتا ہے وہ ترجمہ دیکھنے والے کو نہیں آسکتا اور قاعدہ یہی ہے کہ جو کتاب جس زبان کی ہو اس کا لطف جبھی آسکتا ہے جبکہ اس زبان کو آپ جانتے ہوں۔

بہت سے اشکالات ترجمہ دیکھنے سے قرآن میں پیدا ہوجاتے ہیں، جس کا جواب ذوق لسان ہی سے ہوسکتا ہے، بہت سے اشکالات نحو وصرف کے نہ جاننے سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے ان علوم آلیہ کی بھی ضرورت ہے۔ بلکہ کچھ منطق وکلام کی بھی ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات ان ہی علوم کے جاننے سے رفع ہوجاتے ہیں۔ بعض اشکالات سے ان علوم کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی اور اس کے نظائر بہت ہیں مگر میں نمونہ کے لیے چند مثالیں بیان کرتا ہوں جو طالب علموں کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔

ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھ کو کچھ پوچھنا ہے مگر اول اس آیت کا ترجمہ کردو ''ووجدك ضالًّا فهدىٰ '' میں سمجھ گیا اور میں نے ترجمہ اس طرح کیا کہ ''پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنادیا''۔ یہ ترجمہ سن کر وہ میرے منہ کو تکنے لگے، میں نے کہا اب پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ کہنے لگے کہ اب تو وہ اشکال ہی نہ رہا۔ میں نے کہا تو کیا آپ کیا یہ خیال تھا کہ اس جگہ ضالًّا کا ترجمہ گمراہ سے کروں گا، اور وہ ترجمہ بھی غلط نہیں ہے مگر غلط فہمی زبان نہ جاننے سے ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ اردو میں تو گمراہ کا مفہوم

صرف یہی ہے کہ باوجود وضوح حق کے اس کو قبول نہ کرے اور عربی میں ضلال اور فارسی میں گمراہی کا اطلاق عام ہے، اس معنے کو بھی اور عدم وضوح کو بھی پس ضال کے معنیٰ گمراہ کے بھی ہیں اور بے خبری اور ناواقفی کے بھی ہیں۔

ایک اشکال ترجمہ پڑھنے والوں کو اس آیت پر ہوتا ہے ''ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا ''۔اور ہرگز نہیں دیں گے حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر کوئی راہ، یعنی غلبہ۔

اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بارہا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہوجاتے ہیں۔اس کے بہت سے جواب علماء نے دیے ہیں لیکن اگر قرآن کے ساتھ ذوق ومناسبت ہوتو یہ ضرور یہ سمجھے گا کہ کلام اللہ غیر مرتبط نہیں ہے پھر جب اس کو مرتبط سمجھے گا تو ہر مقام پر سیاق وسباق کو بھی دیکھے گا۔چنانچہ اس آیت پر اشکال اس لیے ہوا کہ لوگوں نے لن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا (حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے) کے سباق کو نہ دیکھا اس میں یہ حکم آخرت کے ساتھ مخصوص ہے، چنانچہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہے فاللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ۔حق تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے، یعنی قیامت میں کفار ومسلمین کا فیصلہ ہوجائے گا کہ کون حق پر تھا کون ناحق پر تھا اس کے بعد فرماتے ہیں ''ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا ''۔اور اللہ تعالیٰ کفار کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے۔یعنی اس فیصلہ میں جو آخرت میں ہوگا اب کوئی اشکال نہ رہا۔بعض دفعہ قاعدۂ صرف کے نہ جاننے سے اشکال پڑتا ہے چنانچہ ایک مرتبہ اخباروں میں یہ خبر مشہور ہوئی تھی کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل ہیں۔اس سے بعض لوگوں کو اشکال ہوا کہ یہ تو قرآن کے منافی ہے۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں ''ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ ''یعنی خدا تعالیٰ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے۔اس کا ایک جواب تو یہی ہے کہ اہل اخبار کی خبر کا اعتبار ہی کیا

کسی نے اس کے پیٹ کو چیر کر تو نہیں دیکھا محض قیاس اور گمان سے یہ حکم لگا دیا ہے کہ اس شخص کے دو دل ہیں، سو ممکن ہے کہ اس شخص کا دل بہت زیادہ قوی ہو اس لیے دو دل ہونے کا شبہ ہو گیا ہو، یہ جواب تو بطور منع کے ہے اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ قرآن میں ماجعل صیغہ ماضی کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت تک خدا نے کسی کے دو دل نہیں بنائے اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ آئندہ بھی کسی کے دو دل نہ بنائیں گے۔ پس اگر یہ واقعہ صحیح ہو تب بھی قرآن پر کوئی اشکال نہیں اور بعض اشکالات کا جواب نحوی قاعدہ سے دیا جاتا ہے۔

چنانچہ میرے پاس ایک ملاجی آئے اور کہنے لگے کہ وضو میں پاؤں دھونا جو فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن میں تو پیروں کے مسح کا حکم ہے۔ میں نے کہا قرآن میں کہاں ہے؟ کہنے لگے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ مترجم قرآن میرے پاس لائے اور یہ آیت دکھائی ’’فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین‘‘۔ ترجمہ یہ لکھا ہوا تھا (پس دھوؤ اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور ملو اپنے سروں کو اور پیروں کو دو ٹخنوں تک) شاہ صاحب نے یہاں فعل مقدر کو ظاہر نہ کیا تھا اور مسح کا ترجمہ محاورہ کے موافق کر دیا۔ ورنہ بعضے تراجم میں تقدیر فعل کو ظاہر کر کے اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ اور دھوؤ اپنے پیروں کو دونوں ٹخنوں تک اور بعض ترجموں میں مسح کا ترجمہ مسح ہی سے کیا ہے۔ اس طرح کہ مسح کرو اپنے سروں کا تو اس میں لفظ نہیں آیا۔

اس ترجمہ پر کچھ اشکال نہیں ہو سکتا مگر شاہ صاحب کے ترجمہ میں ملاجی کو یہ شبہ ہوا کہ پیروں کے لیے بھی مسح کا حکم ہے۔ میں بہت پریشان ہوا کہ اس اشکال کا جواب تو نحوی قاعدہ پر موقوف ٹھہرا۔ اب اگر میں ان کو نحوی قاعدہ سے جواب دوں تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ ان کے سامنے عطف اور تقدیر کی تحقیق بیان کروں جس کو یہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ آخر میں

نے ان سے کہا کہ جس کلام کا یہ ترجمہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کلام اللہ ہے۔ بولے کہ علماء کے کہنے سے معلوم ہوا میں نے کہا افسوس یا تو علماء اتنے ایماندار ہیں کہ اگر وہ ایک عربی عبارت کو کلام اللہ کہہ دیں تو سچے اور یا اتنے بے ایمان ہیں کہ اگر وہ ایک فعل کو مرض کہیں تو جھوٹے۔ اس پر چپ ہوئے میں نے کہا خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھا۔ ایسوں کو ترجمہ دیکھنا بے شک ناجائز ہے۔ اسی طرح بہت سے اشکالات ہیں جن کے جواب علوم آلیہ پر موقوف ہیں۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ عوام کو ترجمہ خود نہ دیکھنا چاہیے بلکہ اگر شوق ہو تو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے۔

غرض اس اشکال کا جواب یہ تھا کہ یہاں ارجلکم کا عطف وجوھکم پر ہے۔ خیر یہ اشکال تو کچھ نہیں پڑا مگر اشکال اس جگہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قراءت متواترہ میں وارجلِکم بالجر بھی آیا ہے اور اس صورت میں بظاہر اس کا عطف رؤسکم کے اوپر اور فامسحوا کے تحت میں ہے۔ اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اس میں یہ جر جوار ہے ورنہ حقیقت میں اس کا عطف فاغسلوا کے تحت میں ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ اس کا عطف فامسحوا کے تحت میں ہے جب بھی پیروں کے لیے مسح کا حکم لازم نہیں آتا کیونکہ محاورات میں بعض دفعہ دو ایسی چیزوں کو جن کے ساتھ دو فعل متعلق ہوتے ہیں اختصار کے لیے ایک ہی فعل کے تحت بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً دعوت کے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ کچھ دانا پانی، ہمارے یہاں بھی کھا لیجئے گا۔ حالانکہ پانی تو پینے کی چیز ہے کھانے کی چیز نہیں ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا کہ کچھ دانہ کھا لیجئے گا۔ پانی پی لیجئے گا۔ مگر اختصار کے لیے ایک فعل کو حذف کر کے دونوں چیزوں کو ایک فعل کے تحت میں ذکر کر دیتے ہیں، اسی طرح اگر کوئی پوچھے کہ تم نے دعوت میں کیا کھایا تھا؟ تو جواب میں کہا کرتے ہیں پلاؤ، زردہ، دودھ، دہی، گوشت کھایا تھا۔ حالانکہ دودھ پینے کی چیز ہے، یوں کہنا چاہئے تھا کہ دودھ (یعنی ایسے مقام پر جہاں دودھ پینا بولا جاتا ہے، دودھ کھانا نہ بولا جائے۔ ۱۲منہ) پیا تھا

باقی چیزیں کھائی تھیں، جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ ارجلکم کا عطف اگر فامسحوا کے تحت میں بھی مان لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ پیروں کے لیے مسح کا حکم ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ''رؤس'' و''ارجل'' کا تعلق اصل میں دو فعلوں سے تھا۔ ایجازاً ایک فعل کو حذف کر دیا گیا اور ظاہر میں دونوں کو فامسحوا کے متعلق کر دیا گیا۔ اور مطلب وہی ہے کہ سر کا مسح کرو، اور پیروں کو دھوؤ۔ عربی میں اس کی نظیر یہ کلام ہے علفته تبناً وماءً غرابارداً (میں نے اس کو گھاس اور ٹھنڈا پانی چرایا) اور اگر وامسحوا کے حکم کو بھی ارجلکم کے متعلق مان لیا جائے تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ دو قراءتیں بمنزلہ دو آیتوں کے ہوا کرتی ہیں، جس طرح دو آیتیں اپنے اپنے حکم کو مستقلاً ثابت کرتی ہیں اور دونوں پر عمل ضروری ہے اسی طرح دو قراءتیں بھی معمول بہا ہوتی ہیں۔ پس ارجلکم قراءت بالجر ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ پیروں کے لیے مسح کا بھی حکم ہے۔ رہا یہ کہ غسل کا حکم نہیں ہے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کیونکہ قراءت نصب غسل کو لازم کر رہی ہے، تو مجموع قراءتین سے یہ ثابت ہوا کہ پیروں کے لیے مسح اور غسل دونوں کا حکم ہے اس طرح کہ قراءت جر بحالت لبس خف (موزہ پہنے) ہے اور قراءت نصب بحالت عدم خف ہے۔ یہ تاویل بھی بہت عمدہ ہے۔ اور ایک توجیہ میرے ذہن میں ایک سوال کے وقت آئی وہ یہ کہ مسح کے معنیٰ ملنے کے ہیں خواہ بدون غسل کے یا مع غسل کے پس دھونا تو ایک قراءت سے اور حدیث متواتر سے فرض ہوا اور ملنا قراءت جر سے مامور بہ ہوا بمعنیٰ مستحب، جس کی وجہ یہ ہے کہ پیروں کی کھال سخت ہوتی ہے تو عادۃً اکثر اس پر پانی بہانا کافی نہیں ہوتا ملنے سے پانی پہنچتا ہے، چنانچہ فقہاء نے اسی اہتمام کے لیے اس کو بھی مندوب کہا ہے کہ وضو کے قبل پاؤں کو تر کر لیا جاوے پھر آخر وضو میں دھویا جاوے۔

غرض آپ نے معلوم کر لیا کہ نحو کی کس قدر ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات اسی سے رفع ہوتے ہیں، چنانچہ ایک نیچری مفسر نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن میں غلامی کے مسئلہ کا

ثبوت نہیں ہے بلکہ ایک آیت سے تو اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ آیت یہ ہے فشدوا الوثاق فاما منا بعدو اما فداء اس سے پہلے جہاد کا ذکر ہے، ارشاد فرماتے ہیں فاذالقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب ۔ پس جب تم کفار کے مقابل ہوتو ان کی گردنیں مارو (یعنی قتل کرو) یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خونریزی کر چکو تو (تم کو دو اختیار ہیں) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا جو کہ احسان ہے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا۔ اس سے اس نئے مفسر نے یہ استدلال کیا کہ اس آیت میں بطور حصر کے دو باتیں مذکور ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تیسری صورت (یعنی غلام بنانا) جائز نہیں اس تقریر سے ایک عالم کو شبہ پڑ گیا اس کا جواب ایک دوسرے عالم نے ان کو دیا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ یہ قضیہ کون سا ہے، حملیہ یا شرطیہ؟ اور شرطیہ ہے تو متصلہ یا منفصلہ اور منفصلہ ہے تو حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو؟ بس اتنی بات میں سارے اشکال کو درہم برہم کر دیا۔ کیونکہ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ قضیہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو یعنی ان دونوں کا جمع کرنا ممتنع ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں صورتیں مرتفع ہوں اور تیسری کوئی اور صورت ہو کیونکہ مانعۃ الجمع کا حکم یہی ہے کہ ان کا اجتماع جائز نہیں ہوتا اور دونوں کا ارتفاع ممکن ہے مثلاً دور سے کسی چیز کو دیکھ کر ہم یوں کہیں کہ یہ چیز یا تو درخت ہے یا آدمی ہے ۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان دونوں کا اجتماع تو ناممکن ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ نہ درخت ہو نہ آدمی ہو بلکہ کوئی تیسری چیز ہو، گھوڑا، بیل وغیرہ ۔ اسی طرح اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے کہ من وفداء دونوں کا جمع کرنا ممتنع ہے البتہ دونوں سے خلو ممکن ہے تو اب اس سے غلامی کی نفی کیونکر ہوئی، سو دیکھئے جو شخص مانعۃ الجمع و مانعۃ الخلو کی حقیقت نہ جانتا ہو وہ نہ اس اشکال کو دور کر سکتا ہے اور نہ جواب کو سمجھ سکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں دوسرا اشکال ہے، آیت یہ ہے ولو علم الله فیهم خیرا لاسمعهم ولو اسمعهم لتولوا وهم معرضون ۔ بظاہر اس آیت میں شکل اول کی صورت معلوم ہوتی ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ: اگر حق تعالیٰ ان (کفار) میں کچھ بھلائی اور خیر

دیکھتے تو ان کو (دین کی باتیں) سنا دیتے اور اگر ان کو سنا دیتے تو وہ اعراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ دیتے۔ شکل اول کے قاعدہ پر اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے لو علم اللہ فیھم خیراً لا سمعھم یعنی اگر حق تعالیٰ ان میں بھلائی دیکھتے تو وہ پیٹھ موڑ دیتے۔ حالانکہ یہ نتیجہ محال کو مستلزم ہے کیونکہ جس صورت میں حق تعالیٰ کو ان کے اندر بھلائی معلوم ہوئی اس صورت میں تو وہ بات کو قبول کرتے، اس حالت میں اعراض کیونکر ممکن تھا کیونکہ اعراض تو شر ہے، خیر کے ساتھ اس کا اجتماع نہیں ہوسکتا ورنہ لازم آئے گا کہ ان میں خیر ہی نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں شکل اول ہی نہیں کیونکہ یہاں حد اوسط مکرر نہیں لا سمعھم اول سے مراد تو یہ ہے لا سمعھم فی حالة علم الخیر فیھم۔ اور ثانی سے مراد یہ ہے کہ لو اسمعھم فی حال عدم علم الله فیھم خیراً۔ حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ کو ان میں بھلائی کا ہونا معلوم ہوتا تو وہ ضرور ان کو دین کی باتیں سنا دیتے اور وہ ان کو قبول بھی کر لیتے اور اگر اس حالت میں کہ خدا کو معلوم ہے کہ ان میں بھلائی نہیں ہے سرسری طور پر ان کو دین کی باتیں سنا دی جائیں تو وہ اعراض ہی کریں گے اب وہ اشکال رفع ہو گیا۔

اس سے آپ کو منطق کی ضرورت معلوم ہوگئی ہوگی اسی طرح علم کلام کی بھی ضرورت ہے کیونکہ قرآن میں بعض مضامین ایسے مذکور ہیں جس کا ظاہری مضمون جو عام طور پر سمجھ میں آتا ہے مراد نہیں مثلاً: فثم وجه الله، یداہ مبسوطتان، علی العرش استویٰ، والسمٰوٰت مطویّٰت بیمینه۔ یعنی کسی جگہ کہا گیا ہے کہ جدھر تم منہ کرو خدا کا رخ ادھر ہی ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ خدا کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔ کہیں فرمایا ہے کہ خدا عرش پر مستوی ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ آسمان خدا کے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ تو اس سے بعض جاہلوں کو یہ شبہ ہوگا کہ خدا کے بھی ہماری طرح منہ اور ہاتھ اور پیر ہیں۔ مگر علم کلام کے دلائل سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ جوارح اور مکان و زبان سے پاک ہے اس کے لیے ان

چیزوں کا ثابت ہونا حقیقۃً ممکن نہیں ہاں مجازاً کوئی دوسرے معنیٰ مراد لیے جاویں تو ممکن ہے۔ چنانچہ علماء نے ان آیات کے معانی خدا کی شان کے لائق بیان بھی کیے ہیں اور سلف کا طرز اس بارہ میں سکوت ہے۔ تو علم کلام سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے لیے کس صفت کا ثابت ہونا ضروری ہے اور کن کن باتوں سے اس کا پاک ہونا ضروری۔ اس لیے دوسرے علوم کی بھی ضرورت ہے اور وہ علوم عربی میں مدون ہیں لہٰذا عربی کی سخت ضرورت ہے، شریعت کا علم کامل بغیر علوم عربیہ کے حاصل نہیں ہوسکتا''۔ (ص ۲۶۶ تا ۲۷۳)

اس بیان سے علوم عربیہ کی اہمیت اور ضرورت واضح ہے اس پر مزید کسی کلام یا تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ پاکستان بننے کے بعد اسلامی حکومتیں دینی تعلیم کی طرف توجہ دیں گی، اور عربی زبان اور اسلامی عربی علوم کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے گا لیکن ستر سال کے قریب عرصہ بیت جانے کے باوجود ہنوز روز اول والا معاملہ ہے، حکومتوں نے عصری علوم کی طرف خوب توجہ دی اور ہمیشہ ان کی سرپرستی کرتی رہیں لیکن اسلامی علوم کو ہمیشہ نظرانداز رکھا گیا۔

حق تعالیٰ حضرات علماء کرام اور مدارس دینیہ عربیہ کے ارباب کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے عام مسلمانوں کے تعاون سے دینی تعلیم کی اشاعت وفروغ کے لیے پوری جدوجہد کی اور اس میں کسی فروگزاشت سے کام نہ لیا، انہیں کی کوششوں کا یہ ثمرہ ہے کہ دینی علوم اور عصری اسلامی اقدار وروایات کی حامل ہزاروں درسگاہیں اس فریضہ کو بحسن وخوبی سرانجام دے رہی ہیں اور بحمد اللہ اس وقت تک ہزاروں علماء کرام حفاظ اور لاکھوں مسلمان ان سے مستفید ہوچکے ہیں۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

دینی مدارس اور جامعات کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ دینی علوم کی حفاظت واشاعت کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کی صحیح تربیت بھی کریں تا کہ یہاں سے پڑھنے اور فارغ ہونے

والے حضرات دینی علوم وفنون اور ہر طرح کے مسائل میں امت کی صحیح راہنمائی کرسکیں۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں کتاب وحکمت کی تعلیم کے ساتھ تزکیہ نفوس کو بھی ذکر فرمایا گیا ہے، بحمد اللہ تعالیٰ بعثت کے انہی مقاصد کی تکمیل دینی مدارس کے ذریعہ سے ہورہی ہے جو کام حکومت اسلامی کے کرنے کا تھا حق تعالیٰ کے فضل سے اسے یہ دینی ادارے پورے طور پر انجام دے رہے ہیں، فللہ الحمدولہ الشکر۔

حکومت وقت اور امت مسلمہ کو ان دینی مدارس کی قدر کرنی چاہیے ان کی اہمیت ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔

دینی اداروں کو بھی دینی اسلامی علوم کی تعلیم اور طلبہ کی اخلاقی تربیت واصلاح پر کماحقہ توجہ دینی چاہئے کہ ان کا اصل مقصد یہی ہے، واللہ الموفق والمعین۔

احقر عبدالقدوس ترمذی غفرلہ

۱۵/شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

درس حدیث

عن عبداللہ بن عمروقال قال رسول اللہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کتب اللہ مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السمٰوٰت والارض بخمسین الف سنۃٍ قال وکان عرشہ علی الماء ۔(رواہ مسلم) حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی ہیں اور فرمایا کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔

تشریح:

اس حدیث میں چند چیزیں غورطلب ہیں :اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کے تقدیر لکھنے سے کیامراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تو ہے نہیں کہ جس طرح ہم انسان ہاتھ میں قلم لے کر کاغذ یا تختی پر کچھ لکھتے ہیں ،ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے لکھا ہو،ایسا خیال کرنا اور کیفیت کے ادراک سے ہم قاصر ہیں اور چونکہ اس کے لیے الگ کوئی زبان اور لغت نہیں ہے،اس لیے ہم مجبوراًانہیں الفاظ سے اس کے افعال وصفات کی تعبیر کرتے ہیں جو دراصل ہمارے افعال وصفات کے لیے وضع کیے گئے ہیں ورنہ اس کے اور ہمارے افعال وصفات کی حقیقت اور کیفیت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ اس کی عالی ذات اور ہماری ذاتوں میں ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس حدیث میں جس کتابت تقدیر کا ذکر کیا گیا ہے،اس کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے،علاوہ ازیں یہ بھی واقعہ ہے کہ عربی زبان میں کسی چیز کے طے کر دینے اور معین ومقرر کر دینے کو بھی کتابت سے تعبیر کیا جاتا ہے،چنانچہ قرآن مجید میں اسی معنیٰ کے اعتبار سے روزہ کی فرضیت کو کتب علیکم الصیام سے اور قصاص کے حکم کو کتب علیکم القصاص سے تعبیر کیا گیا ہے،پس اگر حدیث مذکور میں بھی کتابت

سے یہی مراد ہو، تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار برس پہلے تمام مخلوقات کی تقدیریں معین کیں اور جو کچھ ہونا ہے اس کو مقرر فرمایا (حضرت شاہ ولی اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اسی کو اختیار فرمایا ہے (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۶۶ ج ۱) اس معنیٰ کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ بعض روایات میں بجائے کتب کے قدر کا لفظ بھی آیا ہے۔

اس موقع پر یہ بھی یادرکھنا چاہئے کہ کتابت تقدیر کے سلسلے کی بعض غیر معتبر روایتوں میں قلم اور لوح وغیرہ سے متعلق جو تفصیلات نقل کی گئی ہیں، وہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

دوسری بات اس حدیث کے متعلق یہ بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ پچاس ہزار برس سے مراد بہت طویل زمانہ بھی ہوسکتا ہے، عربی زبان اور عربی محاورے میں یہ استعمال شائع ذائع ہے۔

حدیث کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور پانی اس وقت پیدا کئے جاچکے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ: جس طرح ہماری قوت خیالیہ میں ہزاروں چیزوں کی صورتیں اوران کے متعلق معلومات جمع رہتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عرش کی قوتوں میں سے کسی خاص قوت میں (جس کو ہماری قوت خیالیہ کے مشابہ سمجھنا چاہئے) تمام مخلوقات اوران کے تمام احوال اور حرکات وسکنات کو، غرض جو کچھ عالم وجود میں آنے والا ہے اس سب کو عرش کی اس قوت میں ثبت فرمادیا، گویا دنیا کے پردے پر جو کچھ ہورہا ہے، وہ سب عرش کی اس قوت میں اسی طرح موجود ومحفوظ ہے، جس طرح ہمارے خیال میں لاکھوں صورتیں اوران کے متعلق معلومات ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک تمام مخلوقات کی تقدیر لکھنے سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم

(معارف الحدیث ص ۱۷۵ تا ۱۷۷)

مرسلہ: بندہ محمد صدیق عفا اللہ عنہ

ملفوظات حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ

از جمیل الکلام بقلم: فقیہ الامۃ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی قدس سرہ

خواجہ صاحب نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ مختصر نویسی سیکھ لوں اور ملفوظات ضبط کیا کروں مگر بڈھا طوطا کیا پڑھے، فرمایا بڈھے طوطے پر یاد آیا ایک صاحب نے اپنی بیوی کے پڑھنے کو لکھا تھا کہ شوق تو بہت ہے مگر بڈھا طوطا کیا پڑھے، میں نے لکھا کہ وہ تو بڈھی مینا ہیں، بڈھا طوطا نہیں پڑھتا نہ سہی بڈھی مینا تو پڑھ لے گی۔

فرمایا ایک دفعہ سکندر فوج کا معائنہ کرنے لگا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی دو آدمیوں کے سہارے سے گھوڑے پر سوار ہو رہا ہے، سکندر نے کہا کہ بڑے میاں ایسا کیا شوق ہے فوج میں بھرتی ہونے کا دو آدمیو ں کے سہارے سے تو سوار ہوتے ہو، بوڑھے نے عرض کیا حضور سوار کرنے کو تو دو بھی کافی ہیں مگر اتارنے کو سو بھی ناکافی ہیں۔

عورتوں کے ایثار پر فرمایا کہ میرے خسر صاحب لکھے پڑھے نہ تھے مگر خوش مزاج تھے، ایک دفعہ رات کو ان کی آنکھ کھلی تو خوشدامن صاحبہ کو کروٹیں بدلتے دیکھا تو پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا پیاس لگ رہی ہے، فرمایا اٹھ کر پی لو تو بولیں بس اب کون اٹھے، آدمی بہت ذہین تھے تھوڑی دیر میں خود کروٹیں بدلنے لگے اور کہا کہ تم نے بھی کس چیز کا نام لے دیا اب مجھے بھی پیاس لگنے لگی، وہ یہ سن کر فوراً اٹھیں اور پانی لائیں، جب پانی لے آئیں تو انہوں نے کہا بس پی لو، اس ترکیب سے تمہیں پانی پلوانا تھا، بہت بگڑیں اور لگیں خود کو کوسنے دینے۔

آداب مجلس کے ذکر میں فرمایا کہ خاموشی کا میرے یہاں یہ حال ہے کہ جہاں دو آدمیوں نے کانا پھوسی کی تو میں کہتا ہوں کہ باہر جا کر باتیں کرو یہاں تو میری سنو یا مجھے سناؤ اور آپس میں گفتگو کرنے کی اگر کوئی ضرورت ہی ہو تو باہر جا کر کرو، ایک شخص جلال آباد کے

رئیس آئے تھے مجلس کا رنگ دیکھ کر ایک شخص سے کہا کہ میں اور جگہوں پر بھی گیا ہوں سب جگہ ڈپٹیوں کا اجلاس ہوتا ہے اور یہاں جج کا اجلاس ہے یعنی ڈپٹی کے اجلاس میں تو مدعی مدعا علیہ گواہ وکیل وغیرہ وغیرہ کا شور ہوتا رہتا ہے اور جج کا اجلاس سکون محض ہوتا ہے۔

فرمایا ایک شخص نے یہ حدیث سنی ان اللّٰہ یستحی من ذی الشیبة المسلم وہ بے چارہ اپنے کو عمل سے خالی سمجھتا تھا اس حدیث سے امید ہوئی کہ شاید بوڑھا ہو کر مروں اور حق جل وعلا شانہ بڑھاپے کی وجہ سے بخش دیں، اتفاق سے ان کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا مرنے کے وقت اپنے ایک خاص دوست کو وصیت کی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو ذرا سا آٹا لے کر میری ڈاڑھی اور سر پر چھڑک دینا، اس نے کہا میاں یہ کیا تمسخر کرتے ہو، اس نے کہا تم کو کیا یہ میری وصیت ہے تم کر دینا کیسے دوست ہو ذرا سا کام بھی نہیں ہوتا، اس نے کہا اچھا، جب انتقال ہو گیا وصیت پوری کر دی گئی، کسی کو خواب میں مکشوف ہوا اس نے پوچھا کیا حال ہے اس نے جواب دیا کہ مجھ سے یہ بھی سوال کیا کہ آٹا کیوں چھڑکا؟ میں نے عرض کیا کہ ذی الشیبة تو نہ تھا مگر ذی الشیبة سے مشابہت پیدا کرنے کیلئے ایسا کیا، ارشاد ہوا جاؤ بخش دیا۔ وہاں تو چھوٹی چھوٹی بات پر بھی فضل ہو جاتا ہے اور گرفت اور قہر چھوٹی بات پر نہیں ہوتا سبقت رحمتی علیٰ غضبی مگر یہ جہل ہے اس کا جو بڑی بات کو چھوٹی سمجھے البتہ مقربین پر چھوٹی بات پر بھی مواخذہ ہوتا ہے مگر وہ بھی چھوٹی بات نہیں ہوتی ان کے اعتبار سے وہ بڑی ہی ہے اس لئے وہ کلیہ محفوظ رہا، اس پر فرمایا حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا مجھ سے سوال ہوا کہ تم دنیا سے کیا لائے، عرض کیا کچھ نہیں صرف توحید، فرمایا اما تذکر لیلة اللبن یہ توحید تھی کہ غیر کو مؤثر کہا، عرض کیا حضور کچھ بھی نہیں لایا سوائے امید رحمت کے، اس پر مغفرت ہو گئی۔

حضرت مولانا مفتی سید عبدالکریم گمتھلوی قدس سرہ

ماہ رمضان المبارک کے فضائل واحکام

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شعبان کے آخری روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا (غالباً اخیر تاریخ کو جمعہ واقع ہوا ہوگا یا جمعہ نہ ہوگا تو ویسے ہی وعظ فرمایا ہوگا) اے لوگو! تحقیق سایہ ڈالا تم پر ایک بڑے مہینے نے، برکت والے مہینے نے، وہ ایسا مہینہ ہے کہ اس میں ایک رات ایسی (آتی) ہے جو کہ ہزار مہینے سے بڑھ کر ہے (یعنی لیلۃ القدر) اللہ تعالیٰ نے اس (ماہ) کے روزے فرض کئے اور رات کا قیام تطوع قرار دیا (تطوع کا لفظ کبھی سنت مؤکدہ پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ یہاں سنت مؤکدہ ہی مراد ہے کیونکہ تراویح کا سنت مؤکدہ ہونا ثابت ہے جیسا کہ تراویح کے بیان میں آئے گا) جس نے اس (ماہ) میں کوئی نیک خصلت (از قبیل نوافل) ادا کی وہ اس کے مانند ہوتا ہے جس نے رمضان کے سوا (کسی دوسرے ماہ) میں فرض ادا کیا ہو اور جس نے اس ماہ میں فرض ادا کیا وہ ایسا ہوتا ہے جیسا کہ اور دنوں میں ستر فرض ادا کئے ہوں اور وہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر ایسی چیز ہے کہ اس کا بدلہ جنت ہے اور غمخواری کا مہینہ ہے (کہ اس میں فقراء کی زیادہ غمخواری کی جاتی ہے) اور ایسا مہینہ ہے کہ اس میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے جس میں اس نے روزہ دار کو افطار کرایا اس کو گناہوں سے بخشش اور دوزخ کی آگ سے نجات حاصل ہوتی ہے اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب ملتا ہے، بدوں اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جاوے۔

ہم نے عرض کیا اے رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں ہر شخص ایسا نہیں جو روزہ دار کو افطار کرانے کی مقدور رکھتا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ ثواب تو اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتا ہے جو کہ روزہ دار کو دودھ کی ایک گھونٹ یا ایک کھجور یا ایک پانی کا

گھونٹ (وغیرہ) سے افطار کرادے اور جو شخص روزہ دار کو پیٹ بھر کھانا کھلاوے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی حوض کوثر) سے سیراب کرے گا کہ پھر اس کو جنت میں داخل ہونے تک پیاس ہی نہ لگے گی (اور یہ معلوم ہی ہے کہ جنت میں پیاس نہیں وانك لا تظمأ فيها) پس پیاس سے ہمیشہ کیلئے بےفکری ہو جاتی ہے، حق تعالیٰ ہم سب کو یہ دولت لازوال نصیب فرماوے، آمین ثم آمین۔ اور وہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اول (حصہ) یعنی عشرۂ اولیٰ رحمت ہے اور درمیان اس کا مغفرت ہے اور اخیر حصہ اس کا آگ سے آزادی ہے اور جس نے اپنے باندی غلام سے بوجھ ہلکا کیا اس ماہ میں اس کو اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے اور (دوزخ کی) آگ سے آزاد کر دیتا ہے۔ (بیہقی)

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تمہارے پاس رمضان آ گیا ہے، مبارک مہینہ، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض کئے ہیں، اس میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور سرکش شیطانوں کو طوق پہنائے جاتے ہیں، اللہ کی (بنائی ہوئی) اس میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے جو شخص اس رات کی خیر (وبرکت) سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم رہا۔

ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب کہ رمضان شروع ہو چکا تھا) بے شک یہ مہینہ آیا تمہارے پاس اور اس میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے جو اس سے محروم رہا پس وہ سب بھلائیوں سے محروم رہا اور نہیں محروم ہوتا اس سے کوئی مگر ہر بے نصیب (ابن ماجہ) ۱۲۔

ارشاد فرمایا حق تعالیٰ شانہ نے اے مومنو! فرض کئے گئے تم پر روزے جیسا کہ فرض کئے گئے تھے تم سے پہلے لوگوں پر تا کہ تم بچو (گناہوں سے اور دوزخ کی آگ سے)۔

روزے کے فضائل وآداب

ارشافرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ماہ رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو قید کر دیے جاتے ہیں، شیطان اور سرکش جنات اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں،

پس نہیں کھولا جاتا ان میں سے کوئی دروازہ (پورے مہینہ تک) اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، پس ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا اور پکارتا ہے پکارنے والا، اے خیر کے طلبگار آگے بڑھ اور اے برائی کا ارادہ کرنے والے رک جا اور خدا کے ہاں بہت سے لوگ (ببرکت ماہ رمضان) دوزخ سے آزاد کئے ہوئے ہیں اور یہ (ندا اور پکار) ہر رات ہوتی ہے۔(ترمذی وابن ماجہ واحمد)

اور ارشاد فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بنی آدم کا ہر عمل بڑھایا جاتا ہے (اس طرح کہ) ایک نیکی دس گنا ہوتی ہے سات سو گنا تک، فرمایا اللہ تعالیٰ نے مگر روزہ کہ وہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا چھوڑتا ہے (روزہ دار) اپنی خواہش کو اور اپنے کھانے (پینے) کو میری وجہ سے روزہ دار کے واسطے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی افطار کے وقت ہوتی ہے اور ایک خوشی اپنے رب سے ملنے کے وقت ہوگی اور بالضرور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ اچھی ہے (اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ پھر مسواک کرنا اچھا نہ ہوگا کیونکہ مسواک کے بعد بھی وہ بو جو خلو معدہ کے باعث آتی ہے زائل نہیں ہوتی مسواک سے تو فقط دانتوں کی بدبو دور ہو جاتی ہے) اور روزہ ڈھال ہے (دوزخ سے) اور جب تم میں سے کسی کے روزے کا دن ہو تو اس کو چاہئے کہ نہ فحش بات کہے اور نہ بے ہودہ چلائے، پس اگر کوئی اس کو برا کہے یا اس سے کوئی جھگڑا کرنے لگے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں (متفق علیہ) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص نے (روزہ رکھ کر بھی) بے جا بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑا، اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے اور پینے کو چھوڑنے کی حاجت نہیں ہے (یعنی اس روزہ کو قبول نہیں کرتا) (بخاری) نیز ارشاد فرمایا کہ سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے (متفق علیہ) اور نیز ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی افطار کرے تو اس کو چاہئے کہ کھجور سے افطار کرے کیونکہ وہ برکت (کا سبب) ہے، پس اگر کسی شخص کو کھجور نہ ملے تو اس کو چاہئے کہ پانی پر افطار کرے کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے (ترمذی)

افطار کے وقت کی دعا

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب افطار فرماتے تو یہ دعا پڑھتے: اَللّٰھُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ یعنی اے اللہ! میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے رزق پر افطار کیا۔

اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے: ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی یعنی پیاس گئی اور رگیں تر ہوئیں اور اجر ثابت ہو گیا اگر خدا نے چاہا (ابوداؤد)

تراویح اور تلاوت قرآن شریف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے رمضان کا روزہ فرض کیا ہے اور میں نے اس (کی راتوں) کا جاگنا (یعنی تراویح پڑھنا) مسنون کیا ہے، پس جس شخص نے صرف ایمان اور طلب ثواب کی وجہ سے اس کے روزے رکھے اور اس (کی راتوں) میں (تراویح کے واسطے) قیام کیا وہ گناہوں سے ایسا نکل جاتا ہے جیسا کہ اس دن تھا جس دن اس کو اس کی ماں نے جنا تھا (عین ترغیب عن النسائی) اور نیز ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور طلب ثواب کی وجہ سے بخش دیے گئے اس کے گذشتہ گناہ اور جس نے رمضان میں قیام کیا (یعنی تراویح پڑھی) ایمان اور طلب ثواب کی وجہ سے اس کے (بھی) گذشتہ گناہ بخش دیے گئے اور جس شخص نے ایمان اور طلب ثواب کی وجہ سے لیلۃ القدر کو شب بیداری کی اس کے (بھی) گذشتہ گناہ بخش دیے گئے (متفق علیہ)

اور ارشاد فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے، روزہ کہے گا اے میرے رب! میں نے اس کو کھانے سے اور خواہشوں سے دن بھر روکا پس اس کیلئے میری شفاعت قبول فرما اور قرآن شریف کہے گا میں نے اس کو رات میں سونے سے روکا پس اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما، پس دونوں کی شفاعت قبول

ہوجائے گی۔(بیہقی)

اورارشادفرمایارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بہت روزہ دار ایسے ہیں کہ ان کو روزے سے پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں اور بہت شب بیدار ایسے ہیں کہ ان کو بے خوابی کے سوا کچھ حاصل نہیں (دارمی) جولوگ روزہ کے اورشب بیداری کے حقوق ادانہیں کرتے اس حدیث شریف سے ان کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔اورارشادفرمایارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کوئی نمازی نہیں مگرایک فرشتہ اس کے دائیں ہےاورایک بائیں ہے پس اگروہ شخص نماز کو پورا کردیتا ہےتو وہ دونوں اس کو لے کر(آسمان پر)چڑھ جاتے ہیں اوراگراس کو پورانہ کیا تواس نماز کو اس کے منہ پر مارتے ہیں(روزہ وغیرہ کا بھی اسی طرح حال ہوتا ہوگا)(ترغیب عن الاصبہانی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قول خداوندی ورتل القران ترتیلا کے بارے میں دریافت کیا گیاتو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایااس کوخوب صاف صاف پڑھواور کھجوروں کی طرح اس کو منتشر نہ کرواور نہ شعر کی طرح جلدی پڑھو،اس کے عجائب میں ٹھہر کرغور کرواوراس کے ساتھ دلوں کو متأثر کرواور تم میں سے کوئی شخص (بلاسوچے سمجھے) آخرسورت (تک پہنچنے) کاارادہ نہ کرے(الدرالمنثور)

اورحق تعالیٰ شانہ نے ارشادفرمایاہے (اے کپڑوں میں لپٹنے والے نبی) رات کوکھڑے رہا کرومگرتھوڑی سی رات یعنی آدھی رات یااس سے کچھ کم کردیجئے یا کچھ زیادہ کردیجئے اورقرآن خوب صاف صاف پڑھا کرو(اس حدیث شریف اورآیت مبارک پران لوگوں کوخاص طورسے خیال کرنا چاہئے جوتراویح میں قرآن شریف بے حدتیزی سے پڑھنے کوفخرسمجھتے ہیں)۔

شب قدراوراعتکاف

ارشافرمایاحق تعالیٰ شانہ نے اورنہ مباشرت کرو(یعنی بدن بھی نہ ملنے دو) عورتوں سے جس زمانہ میں کہ تم معتکف ہومسجد میں (اعتکاف کرنا بھی سنت ہے) خاص

کرعشرہ اخیرہ میں تو ہر بستی میں (خواہ وہ شہر ہو یا گاؤں) کم ازکم ایک شخص کا اعتکاف میں بیٹھنا سنت مؤکدہ ہے، اگر بستی بھر میں کوئی بھی نہ بیٹھے تو سب کو ترک سنت کا گناہ ہوگا، جس طرح جنازہ کی نماز ان مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے جن کو اطلاع ہو اسی طرح ہر شہر اور گاؤں پر عشرہ اخیرہ کا اعتکاف سنت کفایہ ہے۔ نیز ارشاد فرمایا حق تعالیٰ شانہ نے کہ لیلۃ القدر بہتر ہے ہزار ماہ سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے قیام کیا شب قدر میں ایمان اور طلب ثواب کی وجہ سے بخش دیے گئے اس کے گذشتہ گناہ (متفق علیہ) و نیز ارشاد فرمایا کہ رمضان میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے جو اس کی خیر سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم رہا۔ (احمد ونسائی)

اور سعید بن المسیب نے فرمایا کہ جو شخص شب قدر کو عشاء کی جماعت میں حاضر ہوگیا اس نے اس میں سے حصہ پالیا (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث شریف میں محروم ہونے والے سے وہ مراد ہے جو اس روز جماعت میں بھی شامل نہ ہوا ہو) اس سے بڑھ کر کیا آسانی ہوگی۔ (مؤطا امام مالک)

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب شب قدر ہوتی ہے تو جبرائیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک جماعت سمیت نازل ہوتے ہیں اور ہر اس شخص کیلئے دعا کرتے ہیں جو کھڑے یا بیٹھے اللہ کا ذکر کررہا ہو اور امام مالکؒ نے کسی معتبر عالم سے روایت کی ہے کہ وہ یوں فرماتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے لوگوں کی عمریں یا ان میں سے جتنی خدا نے چاہا دکھلائی گئیں، پس گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اتنے اعمال سے قاصر خیال فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ایک رات یعنی لیلۃ القدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمادی جو ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ (ترغیب عن المؤطا)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا معتکف کے بارے میں کہ وہ گناہوں سے بچتا ہے اور اس کیلئے نیک عمل (یعنی جن سے اعتکاف مانع ہو مثل عیادت

وغیرہ) جاری کئے جاتے ہیں جیسا کہ ان اعمال کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے (ایسا ہی معتکف کو بھی ملتا ہے) اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے رمضان میں دس روز کا اعتکاف کیا وہ اعتکاف دو حج اور دو عمرے کے مانند ہے (ترغیب عن البیہقی) اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تلاش کرو تم شب قدر کو اخیر عشرہ میں رمضان کے۔ (بخاری)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ جب عشرۂ اخیرہ داخل ہوتا تو کمر مضبوط باندھ لیتے (یعنی عبادت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے) اور شب بیداری کرتے اور اپنے گھر والوں (یعنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور صاحبزادیوں کو جگاتے) (متفق علیہ) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر مجھے (کسی طرح)[1] شب قدر معلوم ہو جائے کہ فلاں رات میں ہے تو میں اس میں کیا کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفُوَ فَاعْفُ عَنِّیْ کہو، یعنی اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے معاف کرنے کو پسند رکھتا ہے پس میرے گناہ معاف فرمادے۔ (احمد و ابن ماجہ و ترمذی)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا لیلۃ القدر کے بارے میں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ ہر رمضان میں ہوتی ہے (ابوداؤد) اور حق تعالیٰ شانہ نے ارشاد فرمایا ہے قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت کی اور طاق کی اور رات کی جب وہ چلے۔

فائدہ: یہاں دس راتوں سے مراد عشرۂ اخیرہ کی دس راتیں ہیں (کما فسرہ ابن عباس کذا فی الدر المنثور) (پس ان کی قسم کھانے سے بڑی فضیلت معلوم ہوئی)۔

....

(۱) یعنی کسی نشانی سے یا کشف وغیرہ سے معلوم ہو جاوے ۱۲

مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم

فضائل ومسائل اعتکاف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اہمیت اعتکاف

اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک میں عبادت کے جومختلف طریقے مقرر فرمائے ہیں ان میں سے بعض طریقے خاص عاشقانہ شان رکھتے ہیں انہیں میں سے ایک عبادت اعتکاف کی بھی ہے اس عبادت میں انسان اپنے تمام دنیوی کام چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے گھر یعنی مسجد میں جاپڑتا ہے اور تمام دنیاوی تعلقات سے کٹ کر اللہ تعالیٰ سے لو لگا لیتا ہے اور کچھ مدت تک کامل یک سوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کے ساتھ مناجات میں مشغول رہنے سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو خاص تعلق اور انابت الی اللہ کی جو خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ تمام عبادتوں میں ایک نرالی شان رکھتی ہے۔ نیز رمضان کی آخری دس طاق راتوں میں سے کوئی نہ کوئی رات شب قدر کی بھی ہوتی ہے اس لئے اعتکاف کرنے والے کو عموماً وہ بھی نصیب ہوجاتی ہے (احکام اعتکاف)

فضائل اعتکاف

رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ان دنوں کا اعتکاف فرماتے تھے اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن بھی اعتکاف کرتی تھیں اور آپ کی وفات کے بعد بھی ازواج مطہرات نے اعتکاف کا اہتمام فرمایا۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: ان النبی ﷺ کان یعتکف العشر الا واخر من رمضان حتی توفاہ اللہ ثم اعتکف ازواجہ من بعدہ ۔کہ

نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اعتکاف کرتی تھیں (بخاری)

(۲) حضرت علی بن حسین اپنے والد ماجد سیدنا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے رمضان المبارک میں آخری عشرہ کا اعتکاف کیا اس کو دو حج اور دو عمرے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ (الترمذی)

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کرنے والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ معتکف تمام گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس کو اس قدر ثواب ملتا ہے جیسے کوئی شخص تمام تر نیکیاں کر رہا ہو (مشکوٰۃ)

(۴) حدیث ابن عباس میں ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے صرف ایک دن کا اعتکاف کیا تو حق تعالیٰ اس معتکف اور دوزخ کے درمیان تین خندقیں حائل کر دیں گے جو لمبائی چوڑائی میں خافقین سے زیادہ وسیع ہوں گی (مشرق ومغرب کے مابین فاصلہ کو خافقین کہتے ہیں) (الترغیب)

اعتکاف کی جگہ

مردوں کا اعتکاف صرف مسجد میں ہی ہوسکتا ہے گھر میں مرد کا اعتکاف کرنا درست نہیں ہے، عورت اپنے گھر میں عبادت کی مخصوص جگہ مقرر کر کے اعتکاف کرسکتی ہے البتہ اسے شوہر سے اجازت لینی ضروری ہے (عورتوں کے اعتکاف کی تفصیل آگے آرہی ہے)

اعتکاف کا معنی

اعتکاف کے لغوی معنی ٹھہرنے کے ہیں اور شرعی معنی یہ ہیں کہ کسی ایسی مسجد میں اعتکاف کے لئے بیٹھنا جس میں پانچ وقت جماعت سے نماز ہوتی ہو۔

اقسام اعتکاف

اعتکاف کی تین قسمیں ہیں (۱) واجب (۲) سنت مؤکدہ (۳) مستحب۔

واجب اعتکاف

جس اعتکاف کی منت مان لی جائے وہ واجب ہو جاتا ہے مثلاً یہ کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو اتنے دنوں کا اعتکاف کروں گا یا یہ کہ میرے اوپر لازم ہے کہ میں اللہ کے لئے اتنے دنوں کا اعتکاف کروں تو اتنے دنوں کا اعتکاف کرنا واجب ہے اسی طرح اگر مسنون اعتکاف فاسد ہو جائے تو اس کی قضا بھی واجب ہے۔

سنت مؤکدہ اعتکاف

رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں جو اعتکاف کیا جاتا ہے یہ سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے یعنی ایک بستی یا محلّہ میں کوئی شخص بھی اعتکاف کر لے تو تمام اہل محلّہ کی طرف سے سنت ادا ہو جائے گی لیکن اگر سارے محلّہ میں سے کسی نے بھی اعتکاف نہ کیا تو سارے محلّہ والوں پر ترک سنت کا گناہ ہوگا۔

مستحب اعتکاف

اعتکاف واجب ومسنون کے علاوہ جو اعتکاف کیا جائے گا وہ نفل اعتکاف ہوگا اور یہ ہر مسجد میں ہر وقت ہو سکتا ہے اور اس کی کوئی مقدار بھی مقرر نہیں ایک منٹ کا بھی ہو سکتا ہے۔

شرائط اعتکاف

(۱) مسلمان ہونا (۲) عاقل ہونا، نابالغ سمجھ دار بچہ کا اعتکاف کرنا بھی درست ہے (۳) اعتکاف کی نیت کرنا (۴) مسجد جماعت میں ٹھہرنا (۵) سنت اور واجب اعتکاف میں روزہ سے ہونا (۶) مرد وعورت کا جنابت سے پاک ہونا (۷) عورت کا حیض ونفاس سے خالی ہونا۔

وقت اعتکاف

رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں جو اعتکاف کیا جاتا ہے وہ اعتکاف مسنون

ہے، اس اعتکاف کا وقت بیسواں روزہ پورا ہونے کے دن غروب آفتاب سے شروع ہو جاتا ہے اور عید کا چاند ہونے تک باقی رہتا ہے اعتکاف کرنے والوں کو بیسویں کو غروب آفتاب کے وقت مسجد میں ہونا چاہئے۔

نیت اعتکاف

مسنون اعتکاف کی اتنی نیت کافی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتا ہوں۔

فائدہ:

معتکف کیلئے ضروری ہے کہ وہ اعتکاف کے دوران مسجد کی حدود میں رہے اور حوائج ضروریہ کے سوا ایک لمحہ کیلئے بھی مسجد کی حدود سے باہر نہ نکلے ورنہ اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

مسجد کی حدود سے مراد وہ جگہ ہے جہاں نماز پڑھی جاتی ہے لہٰذا وضوخانہ اور غسل خانہ مسجد کی حد سے خارج ہیں اور چھت مسجد میں داخل ہے بشرطیکہ سیڑھی کا راستہ مسجد کے اندر ہو۔

معتکف کا مسجد سے باہر نکلنا

درج ذیل امور کیلئے معتکف کو مسجد سے باہر نکلنا بلا کراہت جائز ہے:

(۱) پیشاب و پاخانہ (۲) غسل جنابت جبکہ مسجد میں کرنا ممکن نہ ہو، ٹھنڈک یا جمعہ کے غسل کیلئے باہر جانا جائز نہیں (۳) وضو جبکہ مسجد میں رہتے ہوئے کرنا ممکن نہ ہو اور غسالہ بھی مسجد میں نہ گرے (۴) کھانے پینے کی اشیاء باہر سے لانا جبکہ کوئی لانے والا نہ ہو اور کھانا پینا مسجد میں ہی ہو (۵) مؤذن کا اذان کے لئے باہر جانا (۶) مسجد کے گرنے کی صورت میں یا کسی اور شدید ضرورت کی وجہ سے دوسری مسجد میں منتقل ہونا بشرطیکہ راستہ میں کہیں ٹھہرنا نہ ہو (۷) جمعہ کے لئے اسی شہر کی جامع مسجد میں جانا مگر تقریر سننے کیلئے زیادہ دیر پہلے نہ جائے۔ ان ضروریات کے علاوہ اگر کسی اور مقصد سے باہر گیا تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

نماز جنازہ اور عیادت

نماز جنازہ میں شرکت یا کسی کی بیمار پرسی کے لئے معتکف کا مسجد سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے لیکن اگر قضائے حاجت کے لئے نکلا تھا اور ضمناً راستہ میں کسی کی بیمار پرسی کر لی یا نماز جنازہ میں شامل ہو گیا تو اعتکاف نہیں ٹوٹتا بشرطیکہ مسجد سے نکلتے وقت جنازہ میں شرکت یا بیمار پرسی کی نیت نہ ہو بلکہ قضائے حاجت کی نیت ہو پھر ضمناً شرکت کر لے اور یہ کام راستہ میں ہوں راستہ سے ہٹنا نہ پڑے تو جائز ہے۔

آداب اعتکاف

معتکف کو غیر ضروری باتوں سے بچنا چاہئے اور جس قدر وقت ملے تلاوت قرآن کریم اور دیگر عبادات اذکار و تسبیحات میں گذارنا چاہئے علم دین کا پڑھنا پڑھانا وعظ ونصیحت کرنا اور دینی کتب کا مطالعہ بھی موجب ثواب ہے۔

مباحات اعتکاف

حالت اعتکاف میں درج ذیل کام بلا کراہت جائز ہیں۔

(۱) کھانا پینا (۲) سونا (۳) ضروری خرید وفروخت بشرطیکہ سودا مسجد میں نہ لائے (۴) بضرورت کلام کرنا (۵) نکاح یا کوئی عقد کرنا (۶) کپڑے بدلنا (۷) خوشبو لگانا (۸) کپڑے دھونا (۹) قرآن کریم یا دینی علوم کی تعلیم دینا۔

مفسدات اعتکاف

مندرجہ ذیل چیزوں سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔

(۱) بلاضرورت شرعی مسجد سے باہر نکلنا خواہ جان بوجھ کر یا بھول کر یا غلطی سے بہر صورت اس سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے البتہ اگر بھول کر یا غلطی سے باہر نکلا تو گناہ نہیں ہو گا (۲) کسی شرعی ضرورت سے باہر نکلا ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی باہر ٹھہرا تو اعتکاف جاتا رہا (۳) اعتکاف میں چونکہ روزہ شرط ہے اس لئے روزہ

توڑنے سے بھی اعتکاف جاتا رہا چاہے کسی بھی وجہ سے روزہ توڑا ہو (۴) جماع کرنے سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے چاہے عمداً کرے یا سہواً دن میں کرے یا رات کو مسجد میں ہو یا خارج مسجد (۵) بوس وکنار سے اگر انزال ہوجائے تو اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔

مکروہات اعتکاف

مندرجہ ذیل چیزیں معتکف کیلئے مکروہ ہیں۔

(۱) بالکل خاموشی اختیار کرلینا (۲) فضول یا بلاضرورت باتین کرنا (۳) سامان تجارت مسجد میں لاکر فروخت کرنا (۴) اعتکاف کے لئے ضرورت سے زائد جگہ گھیرنا جس سے دوسرے معتکفین یا نمازیوں کو تکلیف ہو (۵) اجرت پر کام کرنا۔

اعتکاف کا توڑنا

مندرجہ ذیل وجھوں سے اعتکاف توڑ دینا جائز ہے۔

(۱) اعتکاف کے دوران ایسی بیماری ہوگئی جس کا علاج مسجد سے باہر نکلے بغیر ممکن نہ ہو تو اعتکاف توڑنا جائز ہے (۲) کسی ڈوبتے یا جلتے ہوئے آدمی کو بچانے یا آگ بجھانے کے لئے بھی اعتکاف توڑ کر باہر نکلنا جائز ہے (۳) ماں باپ یا بیوی بچوں میں سے کوئی سخت بیمار ہو (۴) کوئی جنازہ آئے اور نماز پڑھنے والا کوئی نہ ہو (۵) کوئی شخص زبردستی باہر نکال کرلے جائے مثلاً حکومت کی طرف سے گرفتاری وارنٹ آجائے۔

ان تمام صورتوں میں مسجد سے باہر نکلنا گناہ تو نہیں مگر اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

اعتکاف کی قضاء

اگر اعتکاف ٹوٹ جائے تو فقط اسی روز کے اعتکاف کی قضا ضروری ہے جس دن کا اعتکاف ٹوٹ گیا ہے پورے دس دن کی قضا واجب نہیں۔ قضاء کا طریقہ یہ ہے کہ اگر رمضان باقی ہو تو ایک دن روزہ سے قضا کرلے اگر یہ ممکن نہ ہو تو بعد میں کسی بھی دن روزے کے ساتھ اعتکاف کرے۔

عورتوں کا اعتکاف

اعتکاف کی فضیلت مردوں کے ساتھ خاص نہیں ہے عورتیں بھی اس سے فائدہ اٹھاسکتی ہیں عورتوں کو اعتکاف گھر میں ہوتا ہے ان کو مسجد میں اعتکاف نہیں کرنا چاہئے گھر میں جو جگہ نماز کیلئے بنائی ہوئی ہے عورت اس جگہ اعتکاف کیلئے بیٹھ جائے اگر کوئی جگہ مخصوص نہ ہو تو بنا کر اس میں اعتکاف کرلے اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو عارضی طور پر گھر کے کسی بھی حصے کو اعتکاف کیلئے مخصوص کر کے اس میں اعتکاف کرے۔

شادی شدہ عورت کو اعتکاف کیلئے خاوند کی اجازت لینا ضروری ہے لہٰذا شوہر کو چاہئے کہ وہ بلا وجہ عورت کا اعتکاف سے منع نہ کرے۔عورت کیلئے ضروری ہے کہ وہ بحالت اعتکاف حیض ونفاس سے پاک ہو اگر دوران اعتکاف ماہواری شروع ہو جائے تو عورت پر واجب ہے کہ اعتکاف چھوڑ دے اور بعد میں صرف ایک دن کی قضا کرلے اگر رمضان المبارک میں وقت مل جائے تو وہی روزہ کافی ہوگا ورنہ ایک دن الگ روزہ رکھ کر قضا کرلے۔

عورت کو بغیر شرعی عذر کے اعتکاف کی جگہ سے ہٹنا جائز نہیں ورنہ اعتکاف ٹوٹ جائے گا جن وجھوں سے مردوں کو اعتکاف سے نکلنا جائز ہے انہیں وجھوں سے عورتیں بھی اعتکاف چھوڑ سکتی ہیں جن کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔عورت اعتکاف کے دوران سینے پرونے کا کام کرسکتی ہے گھر کے کاموں میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہدایت بھی دے سکتی ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ وہ اعتکاف میں زیادہ توجہ عبادت کی طرف دے۔

فائدہ: معتکف بحالت اعتکاف نیک اعمال تلاوت قرآن کریم ذکر واذکار اور دیگر عبادات میں مصروف رہے اور بعض خاص اعمال صلوٰۃ التسبیح ،صلوٰۃ الحاجہ ،تحیۃ الوضو، نماز اشراق ،صلوٰۃ الاوابین نماز تہجد کا بھی اہتمام رکھے کیونکہ ان اعمال کی احادیث میں خاص فضیلت آئی ہے، واللہ الموفق والمعین۔

صلوٰۃ التسبیح

صلوٰۃ التسبیح کا حدیث شریف میں بڑا ثواب آیا ہے اس کے پڑھنے سے بے انتہا ثواب ملتا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یہ نماز سکھائی تھی اور فرمایا تھا کہ اس کے پڑھنے سے تمہارے سب گناہ اگلے پچھلے نئے پرانے چھوٹے بڑے معاف ہو جاویں گے اور فرمایا تھا اگر ہو سکے تو ہر روز یہ نماز پڑھ لیا کرو اور ہر روز نہ ہو سکے تو ہفتہ میں ایک مرتبہ پڑھ لو اگر ہفتہ میں نہ ہو سکے تو ہر مہینہ میں پڑھ لیا کرو ہر مہینے میں بھی نہ ہو سکے تو ہر سال میں ایک مرتبہ پڑھ لو اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو عمر بھر میں ایک مرتبہ پڑھ لو (ترمذی)

صلوٰۃ التسبیح پڑھنے کا طریقہ

صلوٰۃ التسبیح پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ چار رکعت کی نیت باندھے اور سبحانک اللّٰھم اور الحمد اور سورت جب سب پڑھ چکے تو رکوع سے پہلے ہی پندرہ مرتبہ یہ پڑھے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ پھر رکوع میں جائے اور سبحان ربی العظیم کہنے کے بعد دس مرتبہ پھر یہی پڑھے پھر رکوع سے اٹھے اور ربنا لک الحمد کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر سجدے میں جائے اور سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد پھر دس مرتبہ یہی پڑھے پھر سجدے سے اٹھ کر دس مرتبہ پڑھے اس کے بعد دوسرا سجدہ کرے اس میں بھی دس مرتبہ پڑھے پھر سجدے سے اٹھ کر بیٹھے اور دس مرتبہ پڑھ کر دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے اسی طرح دوسری رکعت میں التحیات کے لئے بیٹھے تو پہلے وہی دعا دس مرتبہ پڑھ لے تب التحیات پڑھے اسی طرح چاروں رکعتیں پڑھے۔

(بہشتی زیور حصہ دوم)

شب قدر کا بیان

مسنون اعتکاف رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہوتا ہے اور اسی مبارک عشرہ میں شب قدر جیسی عظیم رات بھی ہے اور اعتکاف کا مقصد بھی اس مبارک اور عظیم

رات کی برکات کو حاصل کرنا ہے اس لئے نہایت ضروری معلوم ہوا کہ ذیل میں اختصار کے ساتھ لیلۃ القدر کا بیان بھی ہدیہ قارئین کردیا جائے، وباللہ التوفیق۔

فضیلت شب قدر

اس رات کی فضیلت اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق پوری ایک سورت نازل فرمائی جو سورۃ القدر کے نام سے مشہور ہے اس میں اس رات کو ہزار مہینے سے بہتر قرار دیا گیا ہے ہزار مہینے کے تراسی سال چار ماہ ہوتے ہیں جو شخص اس رات کو عبادت میں گذار دے گویا اس نے تراسی سال سے بھی زیادہ وقت عبادت میں گزار دیا کیسی سعادت اور خوش بختی کی بات ہے یقیناً وہ افراد خوش قسمت ہیں جو اس رات میں عبادت کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے (عبادت کے لئے) کھڑا ہوا اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ یعنی محض اس عبادت کی وجہ سے اس کے تمام چھوٹے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور بڑے گناہ بھی توبہ کرنے سے معاف ہوجاتے ہیں۔

شب قدر کی تعیین

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لیلۃ القدر کو رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو (الحدیث) اس حدیث سے واضح ہے کہ یہ رات آخری عشرہ کی طاق راتوں یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ میں سے کوئی ایک رات ہے بہت سے صحابہ کرام اور تابعین کی رائے ہے کہ وہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ہے لہٰذا آخری عشرہ کی تمام طاق راتوں بطور خاص ستائیسویں رات کو عبادت میں گزارنا چاہیئے تاکہ لیلۃ القدر کے ثواب سے محرومی نہ ہو۔ حدیث پاک میں اس رات کی خیر سے محروم رہنے والے کو تمام خیر سے محروم رہنے والا فرمایا گیا ہے اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ جو شخص اتنی بڑی نعمت کو ہاتھ سے کھودے وہ یقیناً محروم ہی ہے۔ ۸۴ سال کی عبادت کے لئے

شب قدر میں جاگنا اور عبادت کرنا اس کے لئے بالکل مشکل نہیں جسے اس کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ ہوا گر ذرہ سا چسکا پڑ جائے تو پھر ایک رات کیا سینکڑوں راتیں بھی جاگی جا سکتی ہیں کسی نے سچ کہا ہے۔ ؎

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو   ہر چیز میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

ثواب کی امید رکھنے کیلئے ان راتوں میں جاگنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

شب قدر کے اعمال

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر مجھے شب قدر کا پتہ چل جائے تو کیا دعا مانگوں؟ تو آپ نے فرمایا کہ یوں کہو! اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ اے اللہ! تو بے شک معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے پس مجھے معاف کر دے (مشکوٰۃ شریف)

یہ نہایت ہی جامع دعا ہے اگر حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے آخرت کے مطالبہ سے معاف فرما دیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے۔ ؎

من نگویم کہ طاعتم بپذیر   قلم عفو بر گنا ہم کش

اس رات میں جتنی دیر جاگنا ہو بہتر یہ ہے کہ اس کے تین حصے کر لے ایک حصہ میں نوافل پڑھے اور ایک حصہ میں تلاوت کلام اللہ میں مشغول رہے اور تیسرا حصہ استغفار درود شریف دعا وغیرہ میں گذار دے قرآن کریم کی آیت گرامی اتل ما اوحی الیك من الکتٰب واقم الصلٰوۃ ان الصلٰوۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللّٰہ اکبر (پارہ ۲۱) میں انہی تینوں عبادتوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے اس لئے یہ تینوں عبادتیں کر لے، واللہ الموافق والمعین ۔حق تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک، اعتکاف، لیلۃ القدر کی برکات نصیب فرمائیں اور محرومی سے بچائیں! آمین۔

حضرت مولانا مفتی سید عبدالکریم گمتھلوی رحمہ اللہ

احکام عیدالفطر وصدقۃ الفطر

ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو شخص بیدار رہا عیدین کی دونوں راتوں میں طلب ثواب کیلئے اس کا دل نہ مرے گا جس دن سب دل مردہ ہوں گے (ترغیب عن ابن ماجہ ومعناہ عن اوسط الطبرانی والکبیر) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر قوم کیلئے عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے (متفق علیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (مدینہ میں) تشریف لائے اور ان (اہل مدینہ) کیلئے دو روز تھے جن میں وہ کھیل کود کیا کرتے تھے، پس آپ ﷺ نے دریافت کیا یہ دونوں دن کیا ہیں، انہوں نے عرض کیا ان میں ہم کھیل کود کیا کرتے تھے زمانۂ جاہلیت میں، پس رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کو اللہ نے ان دودنوں کے بدلہ میں ان سے اچھے دو دن عطا فرمائے ہیں، بقرعید کا دن اور عید کا دن (ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب ان کی عیدالفطر کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ فرشتوں پر فخر کرتا ہے، پس ارشاد فرماتا ہے اے میرے فرشتو، کیا بدلہ ہے اس شخص کا جس نے اپنے کام کو پورا کر دیا ہو، وہ عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان کا ثواب پورا دیا جائے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ، میرے بندے اور بندیوں نے میرے فرض کو پورا کر دیا جوان پر ہے، پھر نکلے کہ فریاد کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں قسم ہے اپنی عزت وجلال کی اور اپنے کرم کی اور اپنے علو (شان) کی اور اپنے مرتبہ کے بلند ہونے کی میں ضرور ان کی دعا قبول کروں گا، پس (اپنے بندوں سے خطاب) فرماتا ہے کہ لوٹ جاؤ تم تحقیق میں نے تم کو بخش دیا اور بدل دیا تمہاری برائیوں کو نیکیوں سے (آنحضرت ﷺ نے) ارشاد فرمایا پس وہ (نماز کے بعد) بخشے ہوئے لوٹتے ہیں (بیہقی)۔

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب کہ عید الفطر کا دن ہوتا ہے تو فرشتے رستہ کے دروازوں پر بیٹھ جاتے ہیں، پس پکارتے ہیں اے مسلمانوں کے گروہ چلو رب کریم کی طرف جو احسان کرتا ہے بھلائی کے ساتھ پھر اس پر بہت ثواب دیتا ہے (یعنی خود ہی توفیق عبادت دیتا ہے، پھر خود ہی ثواب عنایت کرتا ہے) اور تحقیق تم کو قیام لیل کا حکم دیا گیا تھا، پس تم نے قیام کیا اور تم کو روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، پس تم نے روزے رکھے اور اپنے پروردگار کی اطاعت کی، پس تم انعام حاصل کرو، پھر جب نماز پڑھ چکتے ہیں تو منادی پکارتا ہے، آگاہ ہو جاؤ بے شک تمہارے رب نے تم کو بخش دیا، پس لوٹو تم اپنے گھروں کی طرف کامیاب ہو کر، پس وہ یوم الجائزہ ہے اور اس دن کا نام آسمان میں یوم الجائزہ (انعام کا دن) رکھا جاتا ہے۔ (جمع الفوائد عن الکبیر)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ (صدقۂ فطر) ایک صاع گیہوں کا دو شخصوں کی طرف سے ہے چھوٹا ہو یا بڑا، آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، سب کی طرف سے نصف نصف صاع ہے، بہر حال تم میں جو غنی ہو اس کو اللہ تعالیٰ پاک کر دیتا ہے (صدقہ فطر ادا کرنے کی وجہ سے) اور تم میں جو فقیر ہو (اور پھر بھی صدقۂ فطر دیدے) تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے دینے سے بھی زیادہ عطا فرما دیتا ہے (ابوداؤد)

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر کو فرض کیا ہے روزے کو بے فائدہ اور فحش باتوں سے پاک کرنے کے واسطے اور مساکین کو کھلانے کے واسطے (ابوداؤد) اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقۂ فطر کا ایک صاع مقرر فرمایا ہے، کھجور سے یا ایک صاع جو سے اور حکم دیا ہے کہ وہ ادا کیا جائے نماز (عید) میں جانے سے پیشتر (متفق علیہ)

پہلی روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ گیہوں نصف صاع دی جاتی ہے، کشمش بھی نصف صاع واجب ہے، اگر کوئی شخص علاوہ ان چار چیزوں (یعنی گندم، کشمش، تمر، جو)

کے دینا چاہے تو قیمت کا اعتبار ہے، پس صاع گندم کی یا ایک صاع جو کی جو قیمت ہو اتنی قیمت کے چاول وغیرہ دیئے جائیں اور صاع دو سو بہتر تولہ کا ہوتا ہے اور نماز عید سے پیشتر صدقۂ فطر کا ادا کرنا مستحب ہے اگر بعد میں دیا جائے تب بھی جائز ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عید اور بقرعید کے روز عیدگاہ میں تشریف لے جاتے، پس اولاً نماز پڑھتے، پھر لوگوں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے اور لوگ صف باندھے بیٹھے رہتے، پس آپ خطبہ پڑھتے (متفق علیہ)

ف: نماز کے بعد خطبہ میں خاموش بیٹھے رہنا واجب ہے، پس جو لوگ شور غل مچاتے ہیں وہ سخت گناہگار ہوتے ہیں اور اسی طرح جو لوگ خطبہ چھوڑ کر چل دیتے ہیں وہ بھی برا کرتے ہیں اور جو لوگ بیٹھتے ہیں وہ بھی صف کا لحاظ نہیں رکھتے حالانکہ صف باندھے رہنا چاہئے، البتہ اگر کوئی شخص بیچ میں سے اٹھ کر چل دیا اس واسطے صف ٹوٹ گئی ہو تو ان بیٹھنے والوں کو گناہ نہ ہوگا بلکہ جو چلا گیا ہے یہ صف توڑنا اس کا فعل ہے، واللہ اعلم۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے رکھے تو ایسا ہو گیا جیسا کہ ہمیشہ (یعنی سال بھر روزے رکھے) (مسلم)

ف: اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نیکی کے بدلہ میں دس نیکیاں ملتی ہیں، پس رمضان کے روزے رکھنے سے دس ماہ کے روزوں کا ثواب مل چکا تھا، چھ روزے اور رکھے تو بقیہ دو ماہ کا ثواب حاصل ہوگا۔

اور حضور ﷺ عیدین کے خطبہ میں تکبیر بکثرت پڑھا کرتے تھے (ابن ماجہ) اور ارشاد فرمایا حق تعالیٰ شانہ نے بے شک نجات پائی اس شخص نے جس نے زکوٰۃ دی (یعنی صدقۂ فطر ادا کیا) پھر اللہ کا نام لیا (یعنی تکبیر پڑھی) پھر نماز پڑھی۔

عبید بن حمید اور ابن المنذر نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے زکوٰۃ سے

مراد صدقۂ فطر اور نماز سے نماز عید مراد ہونا نقل کیا ہے، کذافی الدر المنثور اور حضرت مولانا تھانوی مدظلہم نے فرمایا ہے کہ اس تفسیر پر اگر وذکر اسم ربہ سے راستہ میں تکبیر کہنا مراد لے لیا جائے تو بعید نہیں ہے۔ فقط

کپڑوں کا لوگ بہت اہتمام کرتے ہیں حتی کہ بعض لوگ قرض لے کر نئے کپڑے بنواتے ہیں، بعض مستعار کپڑے پہنتے ہیں، اس اہتمام کی بھی کوئی اصل نہیں ہے بلکہ سنت یہ ہے کہ ہر شخص کے پاس جو کپڑے ہیں ان میں سے جو اچھے ہوں وہ پہنے۔

عید الفطر کے دن بارہ چیزیں مسنون ہیں:

(۱) شرع کے موافق آرائش کرنا (۲) غسل کرنا (۳) مسواک کرنا (۴) عمدہ کپڑے جو پاس موجود ہوں پہننا (۵) خوشبو لگانا (۶) صبح سویرے اٹھنا (۷) عیدگاہ سویرے جانا (۸) عیدگاہ جانے سے قبل کوئی شیریں چیز کھانا (۹) عیدگاہ جانے سے قبل صدقۂ فطر دینا (۱۰) عید کی نماز کیلئے عیدگاہ میں جائے بلا عذر شہر میں نہ پڑھے (۱۱) جس راستہ سے جائے اس کے علاوہ دوسرے راستہ واپس آنا (۱۲) پیادہ جانا اور راستہ میں اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لاالہ الااللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد آہستہ پڑھتا جائے۔

عید الفطر کی نماز پڑھنے کا یہ طریقہ ہے کہ اول یوں نیت کرے: میں دو رکعت واجب عید الفطر مع چھ تکبیروں کے ادا کرتا ہوں، پھر یہ نیت کر کے تکبیر تحریمہ کہتے ہوئے ہاتھ باندھ لے، اور سبحانك اللھم لااله غیرك تک پڑھ کر تین مرتبہ اللہ اکبر کہے اور ہر مرتبہ کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور پہلی دوسری تکبیر کے بعد ہاتھ چھوڑ دے مگر تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لے اور امام قراءت شروع کرے اور مقتدی خاموش کھڑے رہیں اور حسب دستور رکوع سجدہ وغیرہ کریں، پھر جب دوسری رکعت میں امام قراءت کر چکے تو تین تکبیریں مثل سابق کے کہے لیکن یہاں تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ نہ باندھے بلکہ چھوڑ دے اور پھر ہاتھ اٹھائے بغیر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے۔

خطبہ عیدین کا سنت ہے اور حاضرین پر اس کا سننا واجب ہے، اس وقت بولنا، چالنا، نماز پڑھنا وغیرہ حرام ہے۔

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ بعد نماز عید آپس میں معانقہ اور مصافحہ کرتے ہیں اور اس کو ضروری خیال کرتے ہیں یہ بالکل بدعت ہے ہاں جو لوگ باہر کے آئے ہیں اگر ان میں سے بوجہ ملاقات کے مثل اور ایام کے معانقہ اور مصافحہ کیا جائے تو کچھ حرج نہیں۔ عید کے روز باہم ایک دوسرے کو اس لفظ سے تہنیت دینا تقبل اللّٰہ مناو منکم یا اس کے ہم مضمون لفظ سے جیسا عید مبارک وغیرہ جائز اور فی الجملہ مستحب ہے بشرطیکہ بطور رسم کے پابندی کے ساتھ نہ ہو۔

اگر عید جمعہ کے روز واقع ہو تو دونوں کی نماز لازم ہے، اول واجب دوسری فرض، بعض بے علم جمعہ کے روز عید واقع ہونے کو نامبارک سمجھتے ہیں یہ زعم بالکل باطل ہے بلکہ اس میں دو برکتیں جمع ہو جائیں گی، کسی نے خوب کہا ہے۔

عید و عید وعید صرن مجتمعة وجه الحبيب ويوم العيدوالجمعة

ترجمہ: ایک عید اور دوسری اور تیسری، روئے محبوب اور عید اور جمعہ بھی۔

تنبیہ اول

صدقۂ فطر صاحب نصاب پر جیسا اپنی طرف سے واجب ہے اسی طرح باپ کے ذمہ اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے بھی واجب ہے، گو وہ کتنے ہی چھوٹے ہوں۔

تنبیہ دوم

بعض لوگ صدقۂ فطر مؤذنوں اور اماموں کو اس طرح دیتے ہیں کہ جب ان کو مسجد میں رکھتے ہیں تو منجملہ اور اشیاء کے ایک صدقۂ فطر کو بھی ان کی اذان یا امامت کی اجرت میں شرط ٹھہرا لیتے ہیں کہ ہر سال صدقۂ فطر بھی ملا کرے گا تو اس طرح شرط کر کے ان لوگوں کو صدقۂ فطر دینے سے ادا نہیں ہوتا، اگر ایسا کیا گیا ہے تو اس قدر دوبارہ فقراء پر

صدقہ کرنا لازم ہے، ہاں اگر بغیر کسی شرط کے صرف غریب سمجھ کر ان ہی کو دے دیا جائے تو کچھ حرج نہیں ہے اور اگر کسی جگہ مشروط تو نہ ہو مگر معروف ہو تو ایسی جگہ ان کو مسجد میں رکھتے وقت تصریحاً اس کی نفی کر دینا چاہئے کہ صدقۂ فطر نہ ملے گا۔

اضافۂ مفیدہ

ماہِ شوال میں چھ دن نفل روزہ رکھنے کی فضیلت اور دوسرے نفل روزوں سے بہت زیادہ ہے جن کو کہ ''شش عید کے روزے'' کہتے ہیں، لیکن اس میں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کو عید کے اگلے ہی دن سے شروع کر دے تب تو وہ ثواب ملتا ہے ورنہ نہیں ملتا، تو یہ خیال غلط ہے بلکہ اگر مہینہ بھر میں بھی ان کو پورا کر لیا تو ثواب ملے گا خواہ عید کے اگلے ہی دن شروع کرے یا بعد کو شروع کرے اور خواہ لگاتار رکھے یا متفرق طور پر رکھے ہر طرح ثواب ملے گا۔

بعض لوگ ان چھ روزوں میں اپنے پچھلے قضا روزوں کو محسوب کر لیتے ہیں کہ ''شش عید کے روزے'' بھی ہو گئے اور قضا بھی ادا ہو گئی، تو خوب سمجھ لو کہ ان میں قضا کی نیت کرنے سے وہ فضیلت شش عید کی حاصل نہ ہو گی، قضا الگ ادا کرے اور ان کو ثواب کیلئے الگ رکھے، گو بعض کتابوں میں اس کو لکھ دیا ہے لیکن قواعد کے خلاف ہونے سے وہ صحیح نہیں، خوب سمجھ لو۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ

قتل مسلم (آخری قسط)

قاتل کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ثالثاً: اس باب میں فیصلہ کن حدیث وہ ہے جس کو ہم نے اتباع تبویب بخاری اس فصل کا عنوان قرار دیا ہے اور جس کو امام موصوف اور امام مسلم نے مختلف طریقوں سے روایت کیا ہے یعنی من حمل علینا السلاح فلیس منا(رواہ ابن عمر وسلمۃ وابو موسیٰ الاشعری وفی روایۃ سلمۃ من سل علینا السیف) جس مسلمان نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھایا، یعنی حملہ کیا یا لڑائی کی وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے، ومعنی الحدیث حمل السلاح علی المسلمین لقتالھم بہ بغیر حق(فتح ۱۳، ۲۰) یہ حدیث نہایت اہم ہے اور منجملہ قواعد کلیات شریعت کے ہے، اسی لئے امام بخاری نے کتاب الفتن میں ایک خاص عنوان باب قرار دیا اور امام مسلم کتاب الایمان میں لائے تاکہ حقیقت ایمان وکفر کی تحقیق میں اس سے مدد لیں، اور حافظ نووی نے ایک مستقل عنوان قرار دے کر باب باندھا ہے۔

''لیس منا'' کا معنی: لیس منا کے معنی ہیں ''ہم میں سے نہیں ہے''، یعنی ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز تکلم وخطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لیس منا وعید کا ایسا جملہ تھا جو ان موقعوں پر آپ استعمال فرماتے جہاں صریح وقطعی کفر کی جگہ کفر سے کوئی بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کا بتلانا مقصود ہوتا تھا، عام معاصی وفسوق سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے کم ہوتی تھی۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے ان سب پر غور کیا جائے اور ایمان وفکر کے عملی مراتب کی حقیقت بھی پیش نظر ہو جو اوپر گذر چکی تو یہ بات واضح ہو جائے گی، پس کچھ ضروری نہیں ہے کہ لیس منا کے یہ معنی کئے جائیں کہ لیس علی ھدینا یا ظاہر منطوق کو چھوڑ کر کوئی اور تاویل کی جائے یا نفی کو نفی کمال پر محمول کیا جائے۔

صاحب شریعت نے جن کاموں کیلئے جو احکام دیئے ہیں اور جو الفاظ استعمال کیئے ہیں حق نہیں ہے کہ تاویل تو جیہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور واثر گھٹانے کی کوشش کریں، ایسی کوششیں جن لوگوں نے کیں انہوں نے مسلمانوں کو اسلام یا ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا۔ یہ جو آج تمام عالم اسلامی میں تقریباً دو تہائی مسلمان عملاً ایک قلمرو میں مرجی وجہمی زندگی بسر کر رہے ہیں اگر چہ اعتقاداً اہل سنت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اسلام کی تعریف میں "عمل بالارکان " کا لفظ صرف درسی کتاب عقائد کے صفحات پر رہ گیا ہے عمل میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، تو اس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی بدعت تاویل ہے، اسی بدعت کی وجہ سے اعمال کی اہمیت ومطلوبیت بالکل جاتی رہی اور ادعاء اسلام کا سارادارومدار صرف چند جزئیات عقائد کے تحفظ ونزاع پر رہ گیا۔

یہ کیا بات ہے کہ ایک شخص کتنا ہی فاسق وفاجر ہو لیکن اگر چند نزاعی عقائد میں ہمارا ہم داستاں ہوتا ہے تو ہم اس کو دنیا کی سب سے بہتر مخلوق یقین کرتے ہیں؟ اور ایک شخص کتنا ہی صاحب عمل وصلاح ہو لیکن اگر چند اخلاقی جزئیات عقائد میں ہم سے متفق نہیں تو پھر اس سے زیادہ شرالبریہ ہماری نظروں میں اور کوئی نہیں ہوتا؟ وہی عملی مرجیہ وجہمیہ اگر چہ زبان سے ادعاء اتباع سنت وسلف کرتے ہوں، یہی وجہ ہے ائمۂ سلف نے ہمیشہ ایسی تاویلوں سے انکار کیا اور ان تمام راہوں سے بچتے رہے جو رائے اور تعمق کی بدعتوں تک لے جانے والی تھیں۔

اسی حدیث کی نسبت امام نووی اور حافظ عسقلانی وغیرہ لکھتے ہیں: وكان سفيان بن عيينةرحمه اللهتعالٰى يكره قول من يفسره بليس علٰى هد ينا ويقول بئس هذا القول يعنى بل يمسك عن تاويله (شرح مسلم مطبوعہ احمدی: ۲۹، فتح الباری ۱۲/۱۳) یعنی سفیان بن عیینہ اس بات کو مکروہ سمجھتے تھے کہ ليس منا کی تفسیر یوں کی جائے کہ ليس علٰى هدينا اور اس تفسیر کی نسبت کہا کرتے تھے کہ کیا ہی برا قول ہے، مقصود ان کا یہ تھا کہ ان نصوص کی تاویل نہ کرنی چاہئے۔

اسی طرح شیخ عبدالوہاب شعرانی نے میزان میں امام سفیان ثوری کا قول نقل کیا

ہے: ومن الارب اجراء الاحاديث التی خرجت مخرج الزجر والتنفير علیٰ ظاهرها من غير تاويل فانها اذا ولت خرجت من مراد الشارع كحديث من غشنا فليس منا وليس منا من لطم الخدود وشق الجيوب ودعی بدعوی الجاهلية فان العالم اذاولها بان المراد ليس منا فی تلك الخصلة فقط ای وهو منا فی غيرها هان علی الفاسق الوقوع فيها وقال مثل المخالفة فی خصلة واحدة امر سهل۔ليس منا کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ ہم میں سے نہیں یعنی مسلمانوں میں سے نہیں۔اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی کسی جماعت پر بطور جنگ وقتال کے ہتھیار اٹھانا ایک ایسا فعل ہے جس کے کرنے کے بعد انسان مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتا۔

قتل مسلم اور حمل سلاح کی چند صورتیں: البتہ واضح رہے کہ قتل مسلم وحمل سلاح کی متعدد صورتیں ہیں اور ہر صورت کا حکم شرعی دوسری سے مختلف ہے۔ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان مسلمان کو قتل کرے لیکن اس فعل کو جائز نہ سمجھے،اس کی حرمت کا معترف ہواور اس کے ارتکاب پر شرمندہ ومتأسف،تو اس کا حکم وہی ہے جو گذشتہ فصل میں گزر چکا ہے یعنی وہ عملی کفر ہے،مگر اس کا کرنے والا ملت سے خارج نہیں ہوجائے گا،دنیا میں اسلام کے قوی احکام ومعاملات اس پر جاری ہوں گے،عاقبت کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

قاتل کی توبہ کا حکم: باقی رہی یہ بات کہ قاتل مسلم کی توبہ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟تو اس بارے میں خود صحابہ وسلف سے اختلاف منقول ہے،ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ سورۂ فرقان میں ہے: والذين لا يدعون مع الله الهاً اٰخر ولا يقتلون النفس التی حرم الله الا بالحق الخ پھر فرمایا:الا من تاب واٰمن وعمل عملاً صالحاً فاولٰئك يبدل الله سيئاتهم حسنات پس اس سے معلوم ہوا کہ تمام معاصی کی طرح قتل نفس کے مرتکب کی توبہ بھی مقبول ہوسکتی ہے۔لیکن حضرت عبداللہ بن عباس سے بخاری ومسلم وغیرہ میں مروی ہے کہ جو مسلمان مسلمان کو قتل کرے اس کی توبہ مقبول نہیں و ہ فجزاؤه جهنم خالدا فيها الخ کے یہی معنی کرتے ہیں کہ لاتوبة له۔ اور صحیح بخاری کتاب التفسیر میں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ابن عباس سے الا من تاب الخ کی

نسبت پوچھا گیا تو کہا ھذہ مکیة نسخھا آیة مدنیة التی فی النساء یعنی اس آیت کو سورۂ نساء کی آیت من یقتل مؤمنا نے منسوخ کر دیا، پس قبولیت توبہ پر اس سے استدلال نہیں ہوسکتا۔

مسلم کی روایت زیادہ مفصل ہے: لما انزلت التی فی الفرقان قال مشرکوا مکة قد قتلنا النفس ودعونا مع اللّٰہ الٰھا آخر واتینا الفواحش فنزلت الا من تاب وامن الخ،قال فھذہ لاولئك وما التی فی النساء فھو الذی قد عرف الاسلام ثم قتل مؤمنا متعمدا فجزاؤہ جھنم لا توبة له یعنی جب سورۂ فرقان کی یہ آیت: والذ ین لا یدعون مع اللّٰہ الٰھا آخر ولا یقتلون النفس اتری تو مشرکین مکہ نے کہا کہ ہم تو یہ سب کام کر چکے ہیں اب مسلمان ہوئے بھی نجات کب ملے گی؟ اس پر یہ آیت اتری کہ الا من تاب وامن الخ یعنی ہاں لیکن جس شخص نے توبہ کی، ایمان لایا، اچھے کام کئے تو اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو محو کر دے گا، لیکن من یقتل مؤمنا والی آیت مشرکین کیلئے نہیں ہے مسلمانوں کیلئے اتری ہے یعنی جو شخص مسلمان ہونے کے بعد مسلمان کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے اور اس کیلئے توبہ نہیں، انتہیٰ۔ اور امام احمد وطبرانی نے سالم بن ابی الجعد سے بطریق یحی الجابر، اور نسائی وابن ماجہ نے بطریق عمار ذہبی روایت کی ہے، ایک شخص نے ابن عباس سے اس بارے میں سوال کیا تو جواب دیا: لقد نزلت فی اٰخر ما نزل وما نسخھا شیٔ حتی قبض رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وما نزل وحی بعد رسول اللّٰہ اس پر سائل نے کہا: افرأیت ان تاب وامن وعمل عملا صالحا ثم اھتدیٰ؟ کہا وانی له التوبة والھدی؟ یہ لفظ یحیٰ الجابر کا ہے، نسائی وابن ماجہ کے الفاظ بھی قریب قریب ایسے ہی ہیں۔

حاصل ان تمام روایات کا یہ ہوا کہ ابن عباس سورۂ فرقان کی آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں اور اس بارے میں آخر تنزیل سورۂ نساء کی آیت فجزاؤہ جھنم خالدا فیھا ہے اور اس لئے وہ کہتے ہیں کہ مسلمان قاتل مسلم کیلئے توبہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابن عباس کا مذہب کئی پہلوؤں سے قوی نظر آتا ہے:

اولاً: تو اس بنا پر کہ سورۂ نساء کی آیت کا منطوق عدم قبولیت کیلئے ظاہر ونص ہے

خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا، اور منطوق مفہوم پر مقدم ہے جب تک اس کے خلاف کوئی سبب قوی موجود نہ ہو کما تقرر فی الاصول۔

ثانیاً: یہ کہنا کہ سورۂ فرقان کی آیت نے اس کو منسوخ کردیا صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ آیت فرقان مکی ہے اور آیت نساء مدنی، خود ترجمان القرآن اور حبر الامۃ یعنی ابن عباس شہادت دے رہے ہیں کہ نزلت فی آخر ما نزل وما نسخھا شئ اور معلوم ہے کہ ناسخ کیلئے تقدم زمانی ضروری ہے۔

ثالثاً: دونوں آیتوں میں حکم مشترک نہیں ہے کہ متأخرین کا مصطلحہ نسخ مانا جاسکے، دونوں کا مورد الگ الگ ہے، پس اگر نسخ ہوسکتا ہے تو سلف کی اصطلاح میں ہوسکتا ہے جیسا کہ ابن عباس نے کہا یعنی عام وخاص کا نسخ۔ سورۂ فرقان کی آیت میں ذکر کفار کا ہے اور حکم بھی جو دیا گیا ہے وہ انہی کفار کی نسبت ہے جو کفر سے توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور چونکہ الا یمان یھدم ما قبلہ ہے، یعنی اسلام تمام پچھلی برائیوں کو نابود کردیتا ہے اس لئے جب شرک سے توبہ ہوسکتی ہے تو قتل نفس سے کیوں نہ ہو؟ قریش میں جو لوگ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے ان میں کون تھا جس نے خود مسلمان سے قتال نہیں کیا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ الامن تاب کے بعد وامن کا لفظ بھی موجود ہے یعنی ''توبہ کی اور ایمان لایا''، جس سے واضح ہوگیا کہ یہ توبہ اسلام لانے والے کافر کی توبہ ہے نہ کہ ایک مومن کی توبۂ معصیت بعد از اسلام، سورۂ فرقان کا آخری رکوع وعباد الرحمٰن سے پڑھو تو تمام آیات کا ٹھیک ٹھیک محل ومورد واضح ہوجائے گا، وہاں ذکر خدا کے نیک بندوں کے اسلامی وایمانی اوصاف کا ہے انہیں میں ان اوصاف کو بھی داخل کیا ہے کہ نہ تو شرک کرتے ہیں نہ کسی نفس کو قتل کرتے ہیں، نہ زنا کا ان سے ارتکاب ہوتا ہے۔ پھر بتلایا ہے کہ مسلمان جن برائیوں سے بچتے ہیں یہ وہ برائیاں ہیں جن کا نتیجہ عذاب جہنم ہے، اس کے بعد فرمایا الا من تاب وامن ہاں لیکن جو لوگ مسلمان ہوجائیں تو انہوں نے کفر کی حالت میں اس طرح کے جس قدر افعال کئے ہوں ان کا مؤاخذہ نہ ہوگا، اسلام ان کی برائیوں سے آلودہ زندگی کو نیکیوں اور خوبیوں سے بھردے گا۔ پس اس آیت میں

توبۂ کفر کی قبولیت کا ویسا ہی ایک حکم ہے جیسا کہ صدہا مقامات میں وارد ہے، اس کو مسلمان قاتل مسلم اور مرتکب حمل سلاح علی المسلم کے معاملہ سے کیا تعلق؟ اور اگر اس کا ذکر کسی دوسری آیت میں آیا ہے تو کیوں ناسخ ومنسوخ ہونے کی ضرورت پیش آئے؟ دونوں صورتیں بالکل مختلف ہیں، لیکن سورۂ نساء میں قتل نفس کی ایک خاص حالت کا ذکر ہے یعنی اگر ایک مسلمان باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کو قتل کرڈالے تو اس کا کیا حکم؟ فرمایا جزاؤہ جھنم خالدا فیھا چنانچہ اس آیت سے پہلے ہے وما کان لمؤمن ان یقتل مؤمنا الا خطأ الخ، پس زیادہ سے زیادہ دونوں آیتوں میں عام وخاص کا تعلق ہے یعنی اس آیت نے آیت فرقان کی تخصیص کردی اس لئے حضرت ابن عباس نے کہا نسخھا آیۃ مدنیۃ التی فی النساء کیونکہ سلف کی اصطلاح میں ''نسخ'' کا اطلاق ہر طرح کی تخصیص وتقیید پر ہوتا تھا، وہ معنی نہ تھے جو بعد کو اصولیوں نے قرار دیئے۔ اور اسی اختلاف حالت وحکم کو واضح کرنے کیلئے انہوں نے کہا فھٰذہ لاولٰئك یعنی آیت فرقان میں حکم کفار کیلئے ہے، اور امام بخاری کی روایت ابن جبیر بطریق شنبہ مندرجہ کتاب التفسیر میں کہا کانت ھٰذہ فی الجاھلیۃ یہ حکم مشرکین جاہلیت کیلئے تھا نہ کہ مسلمانوں کیلئے۔ اور یہ جو انہوں نے کہا والذین لایدعون مع اللّٰہ الھا اخر ولا یقتلون النفس الخ کے نزول پر مشرکین مایوس ہوگئے تھے اس لئے الا من تاب اتری تو اس کی تائید مفسرین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ نزلت فی قوم لیسوا من التوبۃ یعنی ان لوگوں کے حق میں اتری جو زمانۂ کفر کی بدعملیوں کی بخشش سے مایوس ہوگئے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت اور سورۂ نساء کی آیت ان اللّٰہ لایغفر ان یشرك بہ ویغفر مادون ذٰلك لمن یشاء اور سورۂ زمر کی آیت رحمت یاعبادی الذین اسرفوا علٰی انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللّٰہ الخ وحشی قاتل حمزہ کے بارے میں اتریں، وہ کہتا تھا کہ شرک میں ساری عمر کٹی، پیغمبر کے چچا کو قتل کیا، فواحش میں ہمیشہ مبتلا رہا، الٰہی تین برائیوں سے اجتناب کا خاص طور پر آیت فرقان میں ذکر ہے اب اگر میں مسلمان بھی ہوگیا تو کیا فائدہ؟ مجھے تو نجات مل ہی نہیں سکتی، اس پر الا من تاب وامن اتری، اور پھر مزید بشارت امید کیلئے سورۂ نساء

اورسورۂ زمر کی آیات نازل ہوئیں، تعجب ہے کہ بعض شارحین حدیث کو مذہب ابن عباس کی شرح وتطبیق میں مشکلات کیوں پیش آئیں؟ان کا بیان تو بالکل صاف اورواضح ہے۔

رابعاً: احادیث سے بھی اس مذہب کی تائید ہوتی ہے، مثلا امام احمد نسائی کی روایت معاویہ بطریق ادریس خولانی مرفوعاً: کل ذنب عسی اللّٰہ ان یغفرہ الا الرجل یموت کافرا اوالرجل یقتل مؤمنا متعمدا یعنی تمام گناہ اللہ بخش سکتا ہے لیکن وہ شخص جو حالت کفر میں مرے، یا وہ جس نے جان بوجھ کر مومن کو قتل کرڈالا۔

باقی رہیں وہ احادیث جن میں وسعت رحمت وعموم مغفرت وبخشش وعدم جواز یاس وقنوط وغیرہ کا ذکر ہے تواس مذہب کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی مثل تمام عمومات قرآن کے ہیں جن کی تخصیص آیت نساء اوراس کی مؤیدات فی السنۃ نے کردی، دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔قبل از اسلام معاصی کی بخشش تو مسلم ہی ہے، بحث بعداز اسلام ارتکاب قتل میں ہے،اسی طرح اگرحدیث اسرائیلی الذی قتل تسعۃ وتسعین نفسا ثم اتی تمام الما ئۃثم تاب پیش کی جائے تو جواب یہ ہوگا کہ اس کا محل بھی توبۂ اسلام ہے نہ کہ توبہ مسلم، اوروہ بھی مثل عمومات بشارت رحمت وبخشش کے ہے،مخصصات پراس کا کوئی اثرنہیں پڑتا ہے۔

غرضیکہ اس مذہب کی قوت میں کوئی شبہ نہیں،لیکن عام طور پر علماء نے دوسرے مذہب کو اختیار کیا یعنی قبولیت توبہ کواور خوارج ومعتزلہ کے غلو کی وجہ سے اہل سنت کا رجحان اسی کی طرف بڑھتا گیا وہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کا معاملہ بڑا سخت ہے لیکن توبہ قبول ہوسکتی ہے، اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے بخش دے چاہے نہ بخشے،اس میں شک نہیں کہ احتیاط حکم امید ہی میں ہے نہ کہ پیام یاس وقنوط میں ان اللّٰہ لایغفران یشرك بہ ویغفرمادون ذلك لمن یشاء کے حکم کا عموم بڑا ہی امیدافزا ہے،اوراگراس پرنظرڈالی جائے تو کچھ شک نہیں کہ دوسرامذہب ہی محتاط معلوم ہوتا ہے۔

قتل مسلم کی دوسری صورت: قتل مسلم کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس فعل کوحلال سمجھے اوراس پرنادم ومتأسف نہ ہو، مثلاً کوئی مسلمان فوج ہو وہ یہ سمجھے کہ لڑائی لڑنا تو ہمارا کام ہی

ہے مسلمان سامنے ہوں گے تو انہیں سے لڑیں گے، یعنی مسلمانوں پر تلوار اٹھانا کوئی گناہ کی بات نہیں، یا یوں سمجھیں کہ ہمارے مالکوں کا یہی حکم ہے، ہم نے ان کا نمک کھایا ہے اس لئے ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے، یعنی اگر کوئی اپنا نمک کھلا کر حکم دے کہ مسلمانوں کو قتل کردو تو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، تو اس صورت میں تمام امت کا اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص قطعاً وحتماً کافر ہے، یعنی اس کفر کا مرتکب ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ اس کا حکم شرعاً وہی ہوگا جو تمام کفار و مشرکین کا ہے دنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی، کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں کہ اس کو مسلمان سمجھے اور اس سلوک کا حق دار کہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہئے، یہ حکم خاص اس مسئلہ ہی پر موقوف نہیں ہے ہر محلل حرام غیر مالکوں کیلئے بھی یہی حکم ہے۔

قتل مسلم کی تیسری صورت: تیسری صورت قتل مسلم کی یہ ہے کہ کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہو کر ان کی فتح ونصرت کیلئے مسلمانوں سے لڑے یا لڑائی میں ان کی اعانت کرے، اور جب مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے، یہ صورت اس جرم کے کفر وعدوان کی انتہائی صورت ہے، اور ایمان کی موت اور اسلام کے نابود ہو جانے کی ایک ایسی اشد حالت جس سے زیادہ کفر و کافری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے وہ سارے گناہ، ساری معصیتیں، ساری ناپاکیاں، ہر طرح ہر قسم کی نافرمانیاں جو ایک مسلمان اس دنیا میں کر سکتا ہے یا ان کا وقوع دھیان میں آ سکتا ہے سب اس کے آگے ہیچ ہیں، جو مسلمان اس کا مرتکب ہو وہ قطعاً کافر ہے اور بدترین قسم کا کافر، اس کی حالت کو قتل مسلم کی پہلی صورت پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا۔ اس نے صرف قتل مسلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا ہے، بلکہ اسلام کے برخلاف دشمنان حق کی اعانت ونصرت کی ہے، اور یہ بالاتفاق وبالاجماع کفر صریح وقطعی مخرج من الملۃ ہے۔ جب شریعت ایسی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقۂ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتی تو پھر صریح اعانت فی الحرب اور حمل سلاح علی المسلم کے بعد کیونکر ایمان واسلام باقی رہ سکتا ہے۔ (از معارف مدنی مؤلفہ حضرت فقیہ العصر ترمذی قدس سرہ)

فقیہ العصر مفتی سید عبدالشکور ترمذی قدس اللہ سرہ

مولانا ابوالکلام آزاد اوران کی تفسیر علماء عصر کی نظر میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقَدِّمَۃ

نحمده ونصلى على رسوله الكريم اما بعد:

جو کچھ کہ ہوا، ہوا فضل سے تیرے جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا
ہم کیا ہیں کہ کوئی کام ہم سے ہوگا

اس زمانہ میں قرآن مجید کی تفاسیر اوراس کے تراجم اردوزبان میں بھی بکثرت لکھے جارہے اورشائع ہورہے ہیں ۔بعض تراجم اورتفاسیر اپنی سلاست بیانی اوردلپذیر اندازتحریر کی وجہ سے عوام میں بہت مقبول اورمشہور ہیں مگران میں اصول تفسیر اورقواعد شرعیہ کالحاظ نہ ہونے کی وجہ سے بکثرت ایسے مضامین داخل ہوگئے جواصول شریعت کی روسے غلط اورواجب الرد ہیں۔

ہندوستان میں قدیم ترین اردوترجمہ شاہان دہلی یعنی حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالقادر کا ہے ،حضرت شیخ الہند مولانا محمودحسن دیوبندی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے ترجمہ قرآن مجید کے مقدمہ میں ان دونوں ترجموں کا تعارف کراتے ہوئے ذیل کے نہایت جامع الفاظ رقم فرمائے ہیں:

''ہرچند ترجمہ تحت لفظی میں بعض خاص فائدے ہیں،مگرترجمہ سے جواصل فائدہ اور بڑی غرض یہ ہے کہ ہندوستانیوں کوقرآن شریف کا سمجھنا آسان ہوجائے ۔یہ غرض جس قدر بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہوسکتی ہے تحت لفظی ترجمہ سے کسی طرح ممکن نہیں،چنانچہ شاہ

عبدالقادر جو بامحاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں انہوں نے بامحاورہ ترجمہ کو اختیار فرمانے کی یہی وجہ بیان کی ہے، اور یہی وجہ ہے جو اسلاف ممدوحین کے بعد اس زمانہ میں جس نے اس میدان میں قدم رکھا اس نے جناب شاہ صاحب ممدوح کا اتباع کیا اور بامحاورہ ترجمہ کرنے کو اختیار کیا۔ جس پر کسی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔ شعر

ہر مرغ پر د بہ تمنائے اسیری　　　　اول بشگون کرد طواف قفس مارا

اور یہ امر بھی خوب معلوم ہو گیا کہ جیسے حضرت شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ کمال ہے کہ تحت لفظی ترجمہ کا التزام کر کے ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ایسے ہی حضرت مولانا عبدالقادر رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ کمال ہے کہ بامحاورہ ترجمہ کا پورا پابند ہو کر پھر نظم ترتیب کلمات قرآنی اور معانی لغویہ کو اس حد تک نباہا ہے کہ زیادہ کہتے ہوئے تو ڈرتا ہوں مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ہم جیسوں کا ہرگز کام نہیں۔ اگر ہم ان کے کلام کی خوبیوں کو اور ان اغراض و اشارات کو، جو ان کے سیدھے سیدھے مختصر الفاظ ہیں سمجھ جائیں تو ہم جیسوں کے فخر کے لیے یہ امر بھی کافی ہے''۔ (ص ۱،۲)(۱)

حضرت شیخ الہند نے تو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ کی خدمت کو اپنے ذمہ لیا اور حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ میں جو بعض الفاظ ومحاورات متروک ہو گئے تھے یا بعض مواقع میں ترجمہ کے الفاظ مختصر تھے، حضرت شیخ نے غور و احتیاط کے ساتھ ان الفاظ متروکہ کی جگہ الفاظ مستعملہ کو اختیار کیا اور اختصار و اجمال کے موقعوں میں کوئی مختصر لفظ زائد کر کے اجمال کی تفصیل فرمادی۔ اس خدمت کے بعد حضرت شاہ صاحب دہلوی کا یہ ترجمہ قرآن اور صدقہ فاضلہ مسلمانان ہند اور اردو دان عوام کے لیے قابل استفادہ ہو گیا اور اس ترجمہ کے فوائد مخصوصہ سے فیض یاب ہونا آسان ہو گیا۔

---

(۱) حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمہ کے محاسن اور خوبیوں کی تفصیل کے لیے کتاب ''محاسن موضح القرآن''، مؤلفہ حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی کا مطالعہ کیا جائے۔ اپنے موضوع پر بڑی مفصل اور جامع کتاب ہے۔ عبدالقدوس ترمذی

حاشیہ شیخ الاسلام

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے ترجمہ کی اس عظیم خدمت کے بعد فوائد قرآن حاشیہ پر لکھنے شروع فرمائے تھے، سورۂ نساء تک لکھے تھے کہ حضرت شیخ کی وفات ہوگئی، بعد میں حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان کی تکمیل فرمائی یہ فوائد حضرت علامہ کا ادبی شاہکار ہے ان میں بڑی مشکل مباحث کو عام زبان میں نہایت آسان کر کے بیان کر دیا گیا، بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد دریا کو کوزہ میں بند کیا گیا ہے، نہایت ہی قابل قدر اور لائق اعتناء ہیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ میں بعض آزاد پسند لوگوں نے جو ترجمے کیے تھے ان کے بالمقابل علماء متدینین کے تراجم مقبولہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضرت شیخ تحریر فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ علماء متدینین زمانہ حال کے متعدد تراجم یکے بعد دیگرے بحمد اللہ شائع ہو چکے ہیں جو لوگوں کو مذکورہ بالا خرابیوں سے بچانے کے لیے کافی ووافی وشافی ہیں۔ چنانچہ بندہ کے احباب میں بھی اول مولوی عاشق الٰہی صاحب سلمہ ساکن میرٹھ نے ترجمہ کیا اس کے بعد مولانا اشرف علی سلمہ نے ترجمہ کیا، احقر نے دونوں ترجموں کو تفصیل سے دیکھا ہے جو ان خرابیوں سے پاک صاف اور عمدہ ترجمے ہیں''۔ (مقدمہ ص ۱)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کا ترجمہ اور آپ کی تفسیر ''بیان القرآن''، فہم مطالب قرآن کے لیے کافی اور شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے وافی ہے، زمانہ حال کی تفسیروں میں اس کو امتیازی اور خصوصی مقام حاصل ہے اس کا حکیمانہ اسلوب بیان اور محققانہ طرز استدلال انوکھا اور نرالا ہے اس لیے عوام سے زیادہ یہ تفسیر علماء کرام اور طلباء علوم عربیہ کے لیے کار آمد اور مفید ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علوم متداولہ آلیہ اور معقولات کی اصطلاحات سے واقفیت کے بغیر اس تفسیر سے پوری طرح استفادہ نہیں

کیا جا سکتا، علوم آلیہ علم معقول میں مہارت کے بعد ہی اس تفسیر کے مطالب سے کما حقہ استفادہ ہوسکتا ہے۔

تفسیر بیان القرآن کے بارہ میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''مولانا انور شاہ صاحب نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لیے ہوگی، مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے''۔ (معارف ماہ صفر ۶۳ھ)

اس ترجمہ کی خصوصیات کا تعارف کراتے ہوئے علامہ موصوف رقم طراز ہیں:

''قرآن پاک کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی جس سے حقیر کی نظر میں بڑے بڑے تراجم خالی ہیں، قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے اس لیے تمام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے، مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں۔ یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے۔ اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی اس ترجمہ کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی ہونے نہ پائے اس لیے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں۔ یہ مولانا تھانوی کی عظیم الشان خدمت ہے''۔

پھر تفسیر کا تعارف اور اس کی خصوصیات کا تذکرہ نہایت جامعیت کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

''اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں۔ سلیس و بامحاورہ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ ''ف'' کے اشارہ سے آیت کی تفسیر، تفسیر میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا

گیا ہے۔فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔شبہات وشکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کیے گئے ہیں۔ تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ذیل میں اہل علم کے لیے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کیے گئے ہیں۔یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقتاً مفید ہے کہ تیرھویں[1] صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے،اس لیے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف تحقیقات اس میں یکجا مل جاتی ہیں''۔(معارف مذکور ص ۹۱)

البتہ یہ ضرور ہے کہ تفسیر ''بیان القرآن'' کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ایسے حضرات اہل علم کو ہی ہوسکتا ہے جنہوں نے مطالب قرآنی کے سمجھنے اور سمجھانے اور درس وتدریس میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا ہو اور تفسیر قرآن سے متعلق علوم کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کرنے کا ان کو اتفاق ہوا ہو،ایسے ہی حضرات پر اس تفسیر کی صحیح عظمت ووقعت اور قدر و منزلت کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اس شان اور اس پایہ کی تفسیر کا وجود اہل علم کے لیے بڑی نعمت عظمیٰ اور غنیمت کبریٰ ہے،سرسری نظر کے ساتھ مطالعہ کرنے اور علوم متعلقہ تفسیر سے مہارت وواقفیت حاصل کیے بغیر عام طور پر اس تفسیر کے محاسن اور دقائق عیاں اور ظاہر نہیں ہوتے۔(۲)

''معارف القرآن'' کا تعارف

تفسیر بیان القرآن کے دقیق وعمیق مطالب تک رسائی چونکہ ہر شخص کے لیے مشکل تھی اس لیے کئی مرتبہ اس حقیر کے دل میں خیال آیا کہ کوئی صاحب علم وفہم اور ماہر علوم قرآن وسنت اس کے مشکل ومغلق مقامات کی تشریح وتفسیر کرکے ان کو حل کردے تاکہ حکیم الامت

....

(۱) صحیح چودھویں صدی معلوم ہوتا ہے۔ش (۲) ''بیان القرآن'' کے متعلق تفصیل کے لیے حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مقالہ آپ کی کتاب ''اشرف المقالات'' میں قابل ملاحظہ ہے۔عبدالقدوس ترمذی

تھانوی رحمہ اللہ کا یہ علمی فیض ہر خاص وعام تک بآسانی پہنچ سکے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بابرکت خدمت ہمارے مرشد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حصہ میں لکھی تھی ،حضرت مفتی صاحب موصوف نے ''بیان القرآن'' کی مشکلات اور مغلقات کو حل کرنے میں بہت محنت برداشت فرمائی اور ''معارف القرآن'' میں اس تفسیر کے مشکل مقامات کو بہت آسان زبان اور دلپذیر پیرایۂ بیان میں منتقل فرمادیا۔اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کی اس تفسیری خدمت کو بڑا ہی قبول عام عطا فرمایاہر طبقہ کے مسلمانوں نے اس سے استفادہ کیا اور کررہے ہیں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں جب کوئی ایڈیشن طبع ہوتا ہے ہاتھوں ہاتھ نکل جاتا ہے اس کے طرز بیان اور سلاست زبان کے سامنے بڑے بڑے زبان دانوں اور مشہور ومعروف طرز نگاروں کو عاجز ہوتے دیکھا جارہا ہے۔اس کے ساتھ ہی ''معارف'' کے عنوان کے تحت مسائل حاضرہ پر سیرحاصل تحقیقات کا نہایت گرانقدر اضافہ فرمادیا گیا ہے کہ بعض موضوعات پر تو بڑا تفصیلی مقالہ مرتب ہوگیا،ایسے کئی مقالات ''معارف القرآن'' کی زینت ہیں۔

اس تفسیر معارف القرآن کے محاسن اور فوائد کا تعارف ''البلاغ'' کے مفتی اعظم نمبر میں بڑی تفصیل سے کرایا گیا ہے۔برادرم مولانا محمد سلیم اللہ خان صاحب کے مضمون ''مفتی اعظم اور ان کی تفسیر'' میں بھی بہت عمدہ طریقہ سے تعارف کرایا گیا ہے اور اس ناچیز کے مضمون ''حضرت مفتی اعظم کی تفسیری خدمات'' میں بھی اس تفسیر کے بعض خصوصی مضامین کا تعارف کرایا گیا ہے۔

اس زمانہ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ تفسیر بڑی قابل قدر اور نہایت اہم اور مفید مضامین پر مشتمل ہے پھر زبان نہایت صاف،شستہ اور اسلوب بیان دلنشیں اور بہت عمدہ ہے۔اس زمانہ میں لکھے پڑھے طبقہ کے لیے اس تفسیر میں بے حد جاذبیت ہے اور ان کی رہنمائی کا سامان بھی اس میں کافی وافی موجود ہے۔اس تفسیر کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی

دوسری تفسیر کے مطالعہ کی ضرورت اس طبقہ کے لیے باقی نہیں رہتی۔

تلخیص البیان

''بیان القرآن'' کا خلاصہ ''تلخیص البیان'' کے نام سے حضرت مرشدی مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۳۳۹ھ میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے زمانہ قیام میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے کیا تھا۔ مادہ تاریخ اختتام حضرت مولانا مرحوم نے اس بیت سے نکالا تھا۔

طلبت له التاريخ من عندهاتف فنادى"لتلخيص البيان"عجيب

اور یہ خلاصہ حمائل کے حاشیہ پر اشرف المطابع تھانہ بھون میں شائع بھی ہوا تھا، مگر طباعت میں روشنائی درست نہ لگنے کی وجہ سے بعض جگہ ناقابل استفادہ ہو گیا تھا۔ حضرت مولانا قدس سرہ کا اشتیاق تھا کہ دوبارہ یہ خلاصہ اچھے قابل استفادہ طریقہ پر شائع ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ ۴۳۷ گارڈن ایسٹ کراچی ۵ پاکستان کو توفیق وہمت عطا فرمائی کہ اس نے حضرت مولانا مرحوم کی یہ عظیم تفسیری خدمت بہت عمدہ کاغذ پر خوشخط جلی قلم میں قرآن کریم کے حاشیہ پر طبع کرا کر عام کر دی، جزاهم الله خيراً ونفعنابه واياهم۔

حاشیہ تبیان

حضرت مولانا سعید احمد تھانوی مرحوم (برادر حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی مرحوم) نے ''بیان القرآن'' کا حاشیہ اردو لکھنا شروع کیا تھا مگر مکمل نہ ہو سکا جتنا لکھا ہے وہ خوب ہے، ''بیان القرآن'' کے حاشیہ پر ''تبیان'' کے حوالہ سے جو عبارت ہے یہ حاشیہ حضرت مولانا سعید احمد مرحوم کا ہی ہے۔

تتمۃ البیان

مکمل بیان القرآن پر نظر ثانی کے بعد بعض مضامین کا اضافہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تجویز فرمایا، ترجمہ میں اصلاحات وتشریحات فرمائیں، ان کو اس

عاجز نے بعض افاضل (۱) کے مجموعہ سے ترتیب دیا ہے ۔مکتبۃ الحسن عبدالکریم روڈ قلعہ گوجرسنگھ لاہور نے جو ''بیان القرآن'' تین جلدوں میں شائع کیا اس کے آخر میں اس ''تتمۃ البیان'' کو لگا دیا گیا ہے۔(۲)

سبق الغایات فی نسق الآیات

حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے اگرچہ اپنی تفسیر بیان القرآن میں قرآن مجید کے اول سے آخر تک ہر سورت اور ہر آیت کا ربط ماقبل کے ساتھ نہایت سہل اور قریب تقریر میں بالالتزام بیان فرمایا ہے،مگر ربط آیات قرآنیہ میں ایک مستقل رسالہ بنام ''سبق الغایات فی نسق الآیات'' بھی ارقام فرمایا ہے اس کو غور سے ملاحظہ کرنا بھی ربط آیات قرآنیہ میں ذوق پیدا کرنے کے لیے بہت مفید ہے۔

اہل علم کے لیے مشورہ

طلباء اور ترجمہ قرآن مجید کی تعلیم یا درس وتدریس میں مشغول علماء کرام کی خدمت میں احقر کا مشورہ ہے کہ اگر وہ تفسیر بیان القرآن اور ترجمہ وحاشیہ حضرت شیخ الاسلام کو بالالتزام اپنے مطالعہ میں رکھیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ مطالب قرآنیہ کے حل کے لیے کسی اور تفسیر کی ضرورت نہ ہوگی ۔البتہ مسائل حاضرہ کی مزید تحقیق اور تفاصیل کے لیے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر ''معارف القرآن'' کا مطالعہ ازبس ضروری اور حد درجہ مفید ہے۔اسی طرح ''معارف القرآن'' کا مطالعہ انگریزی دانوں اور جدید تعلیم یافتوں کے لیے بہت مفید ہے۔آسان زبان میں قرآن کریم کے مفہوم ومطلب کو سمجھنے کے ساتھ نئے نئے مسائل کی تحقیقات سے بھی وہ واقف ہوں گے اور ان کے لیے ان کے

(۱) اس سے مراد مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم کی کتاب ''حکیم الامت نقوش وتأثرات'' ہے۔عبدالقدوس
(۲) افسوس کہ اس طباعت کی تیسری جلد سے متعلقہ حصہ ''تتمۃ البیان'' شائع ہونے سے رہ گیا ہے،امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں مکمل شائع ہوگا۔واللہ الموفق۔عبدالقدوس ترمذی غفرلہ

شبہات جدیدہ کا ازالہ اور حل بھی اس میں موجود ہے اور اس کا اسلوب بیان اور طرز ادا بھی نہایت سلیس اور عام فہم نئے مذاق کے لوگوں کے لیے بھی دل پسند اور لائق قبول ہے۔ ان سب محاسن کے ساتھ سلف صالحین کے اتباع کا التزام ہر جگہ کیا گیا ہے، پوری تفسیر میں کسی جگہ بھی سلف صالحین کی اتباع سے انحراف نہیں ہو پایا۔(۱)

زمانہ حال کے بعض جدید تراجم اور نئی تفسیریں

برخلاف زمانہ حال کے بعض جدید تراجم اور نئی تفسیروں کے کہ ان کے تراجم اور تفسیروں میں سلف صالحین کی موافقت کا لحاظ نہیں رکھا گیا، پھر چونکہ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کو ان کی انشاء پردازی اور طرز نگارش سے محبت وانس ہوتا ہے اور قرآن کریم کے صحیح مفاہیم اور مطالب سے وہ نا آشنا ہوتے ہیں اس لیے وہ اسی بات کو درست اور منشاء قرآن کریم کے موافق سمجھ لیتے ہیں جو ان کو الفاظ کی بندش اور سحر نگاری سے بتلایا گیا ہے، چنانچہ ایسے بعض تراجم پر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی اصلاحات وتنبیہات شائع ہو چکی ہیں۔

ترجمہ نذیریہ اور ترجمہ مرزا حیرت

مثلاً ڈپٹی نذیر احمد صاحب اور مرزا حیرت کے ترجموں پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اصلاحات وتنبیہات تحریر فرمائیں اور ''اصلاح ترجمہ دہلویہ'' اور ''اصلاح ترجمہ مرزا حیرت'' کے نام سے مستقل رسائل کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اس زمانہ میں ایک قرآن شریف کا ترجمہ طبع ہوا ہے، اس میں وعلى الذين يطيقونه فدية کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دیدے، اس سے لوگوں کو جرأت

....

(۱) حال ہی میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کا اردو ترجمہ مع مختصر تفسیر ''آسان ترجمہ قرآن'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے، جو عوام وخواص کے لیے بہت مفید ہے۔ شائقین حضرات کے لیے اس کا مطالعہ بھی بہت مفید ہے۔ عبدالقدوس ترمذی

بڑھ گئی اور بجائے روزہ کے فدیہ کو کافی سمجھ لیا۔ یاد رکھو کہ یہ تفسیر اس آیت کی بالکل غلط ہے''۔

سورۂ یوسف میں ہے: ذھبنا نستبق ''استباق'' کا ترجمہ ان مترجم صاحب نے ''کبڈی کھیلنا'' کیا ہے۔ یہ ترجمہ نقلاً بھی بالکل غلط ہے اور عقلاً بھی، نقلاً تو اس لیے کہ لغۃً ''استباق'' کے معنیٰ ہیں آپس میں اس طرح دوڑنا کہ دیکھیں کون آگے نکلے اور عقلاً اس لیے کہ کبڈی کھیلنے میں اتنی دور نہیں جایا کرتے کہ جس سے محافظ بچہ کی نسبت بھڑیے کے کھا جانے کا احتمال ہو، اگر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام ضرور جرح فرماتے''۔ (وعظ الصوم ص ۱۷، ۱۸)

''اسی طرح روزہ کے بارہ میں اس قدر گڑبڑ کی ہے کہ جس کی حد نہیں، اور آیت کی تفسیر بالکل اپنی رائے سے خلاف مقصود کی ہے۔ یطیقون کا ترجمہ اثبات کا کیا اور نسخ سے انکار کر دیا حالانکہ یہ آیت معنیٰ اثبات پر منسوخ ہے اور عدم نسخ کی تقدیر پر معنیٰ نفی پر محمول ہے تو ایک توجیہ پر تو اصول کے جاننے کی ضرورت ہے اور دوسری توجیہ پر عربیت کے جاننے کی ضرورت ہے''۔ (ضرورۃ العمل فی الدین ص ۱۶)

تفسیر القرآن

سرسید کی ''تفسیر القرآن'' میں بکثرت خلاف تعلیمات اسلام عقائد مذکور ہیں اور جگہ جگہ اجماع اہل اسلام کے خلاف مضامین درج ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر کے عقائد زائغہ کو بزبان فارسی ایک جدول میں جمع فرمایا تھا، جدول امداد الفتاویٰ ج ۶ ص ۲۲۵ تا ص ۲۸۷ پر افادہ عوام کے لیے شائع ہو چکا ہے، ان عقائد باطلہ کی وجہ بطلان بتلانے کے لیے اس جدول میں ایک خانہ بھی ہے جس میں وجہ بطلان کا ذکر کر دیا گیا ہے، یا نشان مقام کتاب ''البرہان'' کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔

کتاب ''البرہان''

بزبان اردو تین جلدوں میں سرسید کی ''تفسیر القرآن'' کی ایک جلد کا بے نظیر جواب ہے جس کی جلد اول انجمن اسلامیہ گلزار ابراہیم مراد آباد اور جلد ثانی اور ثالث گلزار

احمدی مرادآباد کے زیر اہتمام طبع ہوئیں ۔ یہ حضرت مولانا محمد علی صاحب بچھرایونی کے قلم حقیقت رقم کا شاہکار ہے اس کی مکمل فہرست مضامین حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مذکورہ جدول کے بعد امدادالفتاویٰ ج ۶ ص ۲۸۸ تا ص ۳۲۴ پر شائع فرمادی ہے ۔ اس فہرست مضامین سے سرسید کی ''تفسیر القرآن'' کے عقائد زائغہ اور اوہام باطلہ کا کافی حد تک علم حاصل ہوسکتا ہے ۔ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ ان تفاسیر اور تراجم کے تذکرہ کے بعد جو اہل حق کے مسلک کے مطابق ہیں فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مرزا حیرت، محمد علی قادیانی لاہوری کے تراجم مخدوش اور بڑے مشتبہ ہیں، اہل سنت والجماعت کے بنیادی عقائد سے انحراف اور اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرنے کا صحیح الزام ان پر ہے اور رہے گا ۔ بعض مفسرین مثلاً سرسید احمد خان اور حکیم احمد حسن امروہی نے صریحاً قرآنی مضامین میں تحریف سے کام لیا ہے قرآنی مراد و منشا کو اپنے محمل سے ہٹانے کی کوششیں ان کی طرف سے بے حد افسوس ناک ہیں'' ۔

سرسید احمد خان کی تفسیر کے بارہ میں مولانا محمد یوسف بنوری کی رائے

''انہوں نے بڑی جسارت کے ساتھ (ملائکہ) کے وجود کا انکار کیا اور کہا کہ انسان ہی کی ملکی قوتوں اور خیر کی صلاحیتوں کا نام شریعت میں ''مَلَک'' ہے ۔ اسی طرح شیطان کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ فطرت انسانی کی کمزوریوں اور اس کی شرآمیز جدوجہد کی تعبیر قرآن ''شیطان'' سے کرتا ہے.... اور معاد میں وہ صرف روحانی کے قائل ہیں، فلاسفہ کی طرح آسمانوں کے وجود، روح، نبوت کی حقیقت پر انہوں نے اسلامی نقطہ نظر سے بہت دور ہٹ کر گفتگو کی ہے، حد تو یہ ہے کہ نبوت کو وہبی نہیں بلکہ کسبی کہتے ہیں ۔ نبوت کی صفات میں تاویلات کرتے ہوئے نبی اور مصلح کے باہمی فرق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ انبیاء علیہم السلام کے خوارق کے منکر ہیں اور تمام ہی ضروریات دین میں رکیک تاویلات کے قائل ہیں..... بہرحال ان کی تفسیر تاویلات و تحریفات سے پر ہے، قدم

قدم پر ان کی ذہنی مرعوبیت اور یورپ کی عقل پرستی کی اندھا دھند تقلید ان کے مضامین میں نمایاں ہے۔ غالباً مولانا عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر ''حقانی'' سر سید احمد مرحوم ہی کے جواب میں لکھی گئی، اس لیے کہ ''حقانی'' میں رکیک تاویلات وتحریفات کے شافی جوابات موجود ہیں''۔(ص۴۴ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۵۷ء)

تفسیر ترجمان القرآن

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی مرقومہ ترجمہ وتفسیر ہے۔اس میں بھی بہت سے مضامین اہل حق کی تحقیقات کے خلاف درج ہوگئے ہیں اور جب اس تفسیر کی پہلی جلد سورۂ انعام تک شائع ہوئی تھی اسی وقت سے اس پر تبصرہ اور تنقید کا حق علماء حق نے ادا کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ فتاویٰ امدادیہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ جلد۴ میں توحید الحق کے نام سے ایک مفصل مضمون از ص۶۵۶ تا ص۶۷۹ شامل ہے۔جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریۂ وحدت ادیان پر قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں بھرپور تنقید کی گئی ہے اور اس کے ضمیمہ از ص۶۷۹ تا ص۶۸۴ میں اس تفسیر کے بعض مقامات کی نشاندہی کے ساتھ کلام کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی (اہل حدیث) نے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ ''واضح البیان میں''تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے اس نظریہ پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔

نیز ''مشکلات القرآن'' کے مقدمہ ''یتیمۃ البیان'' بزبان عربی میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے خلاف حق تفردات پر بہت صاف صاف لکھا ہے۔ پھر اس کا ترجمہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں بھی شائع ہو چکا ہے جس کو ہم اس مقدمہ کے بعد بعینہ درج کر رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی سابق ناظم اعلیٰ جمعیت علماء ہند مرحوم نے اپنی کتاب ''قصص القرآن'' میں جو خدمت انجام دی ہے وہ بہت ہی قابل قدر اور لائق شکر ہے مولانا مرحوم نے اس تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے ایسے مقامات پر بڑے

بسط وشرح کے ساتھ بحث کی ہے، جن میں مولانا آزاد کا قدم جادۂ اعتدال سے ڈگمگا گیا تھا اوران کا راہوار قلم حق وتحقیق کے خلاف راہ پر گامزن ہو گیا تھا۔

مولانا احمد رضا صاحب بجنوری شارح بخاری نے اپنی شرح بخاری ''انوارالباری'' میں بھی جابجا اس تفسیر پر کلام کیا ہے۔

مگر چونکہ اس طرح کی تمام تنقیدات اور تبصرہ جات مختلف اصحاب قلم کے ذریعہ متفرق طور پر شائع ہوئے ہیں ان سے استفادہ ہر شخص کے لیے مشکل ہے اس لیے اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ کوئی صاحب قلم ''ترجمان القرآن'' کے متعلق لکھے گئے ان تمام تحریرات سے استفادہ کر کے ایک مجموعہ مرتب کردے جس کو دیکھ کر ''ترجمان القرآن'' کی صحیح حیثیت اور تفسیروں میں اس کا مقام معلوم ہوجائے۔اب رسالہ ''خدام الدین'' لاہور میں اس تفسیر کی تیسری جلد پر تبصرہ نظر سے گزرا۔''خدام الدین'' کے اس تبصرہ کو دیکھ کر اس ضرورت کا احساس قوی ہوا۔اوراس تفسیر کی شرعی حیثیت متعین کرنے کی پہلے سے زیادہ ضرورت واہمیت بڑھ گئی، اس لیے بنام خدا مختصر طریقہ پر اس مجموعہ کی ترتیب شروع کردی ہے،والله الموفق والمعین۔

اس مجموعہ کی ترتیب وتالیف میں نہ صرف یہ کہ متذکرہ مضامین اور تنقیدات سے استفادہ کیا جائے گا بلکہ انہی مضامین کا اجمالی خلاصہ ضروری ترمیم واضافہ کے ساتھ نئے طریقہ پر مرتب کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا تاکہ ان کو آسانی کے ساتھ ایک جگہ مرتب شکل میں اس تفسیر کے متعلق ضروری مباحث دستیاب ہوسکیں اور وہ ان سے فائدہ حاصل کرسکیں اس لیے جو شخص بھی ''ترجمان القرآن'' کے مطالعہ کا شوق رکھتا ہو اور اس کے محاسن پر اس کو اطلاع ہو اس کو اس مجموعہ سے رہنمائی حاصل کر کے اس تفسیر کے نقائص ومعائب پر مطلع ہونا بھی ضروری ہے۔

تفسیر ''تفہیم القرآن''

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کا حال بھی ترجمان القرآن سے ہی

تقریباً ملتا جلتا ہے اور دونوں تفسیروں کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مقامات پر ایک دوسرے کے موافق ہیں جبکہ وہ تحقیق علماء سلف کے خلاف ہو جاتی ہے اس پر علماء عصر اپنی آراء کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مفتی اعظم پاکستان نے بھی اپنی مایہ ناز تفسیر ''معارف القرآن'' میں ''تفہیم القرآن'' کے بعض اغلاط پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے اور حق و باطل کو واضح فرما دیا ہے۔ اس لیے ''تفہیم القرآن'' کے مطالعہ کرنے والوں کو تفسیر ''معارف القرآن'' کی طرف رجوع کرنا چاہیے ورنہ سخت خطرہ ہے کہ ناظرین ''تفہیم القرآن'' کے غلط مضامین کو صحیح سمجھ کر غلطی اور گمراہی میں نہ پڑ جائیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے اپنے مقدمہ ''یتیمۃ البیان'' میں زمانہ حال کی تفسیروں کے ساتھ ''تفہیم القرآن'' پر بھی تنقید کی ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔

اس سلسلہ میں احقر کا مختصر رسالہ(۱) ''ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے نظریات پر ایک نظر'' بھی مفید ہوگا۔ اس رسالہ میں تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے کئی مقامات پر مختصر طریقہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

ان دونوں تفسیروں کے بعض مقامات کے متعلق ضروری تفصیلات پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ ان تفسیروں کے مطالعہ کرنے والے کسی غلط نظریہ کو قائم نہ کرلیں چنانچہ آئندہ صفحات میں کسی قدر ضروری تفصیلات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پہلے حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا مذکورہ مضمون اور پھر دیگر حضرات کی تحریرات پیش کی جائیں گی۔

۸ر ربیع الاول ۱۴۰۳ھ بعد نماز ظہر

(۱) عرصہ ہوا یہ رسالہ الگ شائع ہوا تھا۔ تین سال قبل مجلّہ ''ماہنامہ الحقانیہ'' بابت ربیع الاول ۱۴۳۲ھ تا جمادی الاول ۱۴۳۲ھ تین قسطوں میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ عنقریب ان شاء اللہ الگ شائع کیا جائے گا۔ عبدالقدوس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدلله و كفٰى وسلام علٰى عباده الذين اصطفٰى امابعد:

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے بارہ میں جو اپنی رائے گرامی ''مشکلات القرآن'' کے مقدمہ ''یتیمۃ البیان'' (عربی) میں ارقام فرمائی ہے اس کا اختصار ناظرین کے سامنے پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اس سے مصنف اور اس کی تفسیر کا حال اور مقام معلوم ہونے میں مدد مل سکتی ہے، تفسیر کے بارہ میں نمونہ کے طور پر جن مقامات کا تذکرہ مولانا بنوری مرحوم نے کیا ہے اور بتلایا ہے کہ ان میں ابوالکلام نے اپنی خواہش کے موافق تفسیر کی ہے اور آیات کی ایسی تاویل کی ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، ان کو ہم ذیل میں ماہنامہ دارالعلوم دیوبند سے بلفظہ نقل کریں گے۔

پہلے مختصر طریقہ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے بارہ میں مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے تاثرات نقل کیے جاتے ہیں جن سے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا مقام اور حال معلوم ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارہ میں علامہ بنوری کی رائے گرامی

مولانا بنوری مرحوم فرماتے ہیں:

''ابوالکلام احمد دہلوی بہت تیز طبع اور وسیع المعلومات، اردو میں صاحب بیان شخص ہیں اور اپنے زمانہ میں اردو زبان کے انشاء اور.... خطابت کے یکتا ہیں مگر اپنی رائے پر اعجاب بھی ان میں ہے اور کسی امام کے بھی فروع میں مقلد نہیں ہیں اس سے بڑھ کر اکابر امت کے ساتھ سوء ادب کے ساتھ پیش آتے ہیں اس کے باوجود ''امام الہند'' بننے کی کوشش کی مگر علماء دیوبند نے امامت کی اہلیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس لیے اس میں ان کو ان کی خواہش کے موافق کامیابی حاصل نہیں ہوسکی''۔

مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

''ابوالکلام نے کہا کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ مسیح ابن مریم نازل نہ ہوں گے علیہ السلام''۔

اس پر مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ:

میں نے ان کو لکھا کہ یہ اعتقاد کیسے درست ہوسکتا ہے، حالانکہ حضرت مسیح کے نزول کے بارہ میں متواتر احادیث آئی ہیں؟ تو ابوالکلام نے جواب دیا کہ:

''مسیح کے نزول کا تذکرہ قیامت کے اشراط وعلامات کے سلسلہ میں آیا ہے، عقیدہ میں داخل نہیں ہے''۔

یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس بات کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہو اور وہ صحیح سند متصل کے ساتھ شرقاً وغرباً تمام روئے زمین پر متواتر طریقہ سے پھیل گئی ہو اس کے بعد اس پر ایمان لانے اور یقین کرنے کے لیے کس بات کی انتظار باقی ہے؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کی تصدیق کرنا عقیدہ میں داخل نہیں ہے؟۔

مولانا آزاد کا ترجمان القرآن

حضرت مولانا آزاد اپنی ہمہ گیر شخصیت، فضل وکمال، غیر معمولی ذکاوت وذہانت، تدبر وفراست اور سیاسی خدمات کی بنا پر یقیناً لائق احترام اور لائق صد اکرام ہیں لیکن متعدد مواقع پر تعلیمات اسلامی میں کھلی ہوئی جدت آرائیوں کا ان کی جانب سے جو مظاہرہ ہوتا رہا، اس سے علمی ودینی حلقوں کو ان سے شکایت پیدا ہوگئی ہے۔

''تذکرہ'' کے بعض مباحث جو سیدنا امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں اور اسی طرح دوسرے ان کے اجتہادات جس کے اظہار میں ان کا قلم بہت زیادہ رواں دواں رہا ہے۔ اس قابل نہیں کہ ان سے تسامح کیا جائے، بلاشبہ یہ ایک طرح کی مداھنت ہوگی کہ ہم ان کی تفسیر کے متعلق اپنی کسی رائے کا اظہار نہ کریں۔ صرف ان کے غیر معمولی اثرات ورسوخ سے متاثر ہوکر۔

مولانا آزاد کے صاف اور شگفتہ قلم نے تفسیر سورۃ فاتحہ میں غیر معمولی جولانی کا مظاہرہ کیا ہے، انہوں نے اھدنا الصراط المستقیم کی تشریح کرتے ہوئے یہ غلط دعویٰ کیا ہے کہ:

''تمام ادیان عالم خواہ نصرانیت ہو یا یہودیت، صابئیت یا اور کوئی دین۔ برحق اور سچے ہیں اگر کوئی شخص اس دین کو جس کو خدا کا کوئی پیامبر لے کر آیا ہے اپنالے اور اس کی کلیات وجزئیات پر عمل کرلے تو نجات کے لیے کافی ہوگا۔ کیونکہ تمام ادیان کی بنیاد ایمان باللہ، عمل صالح ہے، شرک اور بداعمالی تحزب وتشیع کی مذموم پیداوار ہیں''۔

مولانا نے اپنے اس خیال کو اپنی تفسیر میں بے حد پھیلایا ہے بلکہ ان کی تمام تفسیر اسی بنیاد پر قائم ہے ان کو اصرار ہے کہ یہی قرآن کی تعلیم ہے اور اسی کو قرآن کا ''مغز'' کہنا چاہیے۔ ان تحقیقات پر قرآن کی اس آیت سے سہارا پکڑا گیا ہے: ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ مولانا کے خیال میں عمل صالح، احکام تکلیفیہ وشرائع سے نہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ عبادات وشرائع، ظواہر ورسوم ہیں، صورت وجسم ہیں، روح وحقیقت نہیں۔

ان الدین عنداللہ الاسلام، ومن یتبع غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین کی سی غیر مبہم وواضح آیات کو اپنی راہ کا پہاڑ سمجھ کر انہوں نے اس طرح ہٹایا ہے کہ اسلام سے مراد ''وحدت دینیہ عامہ'' ہے کہ وہ کسی شریعت کی خصوصیت نہیں بلکہ سب ملتوں کا مشترک سرمایہ ہے۔ عقائد کے باب میں اس زبردست اور خطرناک لغزش کے بعد تاویلات وتحریفات کے تاریک وخوفناک گڑھے سامنے آسکتے ہیں، وہ ظاہر ہے اہل سنت والجماعت کے عقائد سے دوری پیدا ہوگی اس انفرادیت کا انجام بھی اچھا نہیں نکلے گا، اللھم اھدنا۔

اس کے علاوہ مولانا نے کئی جگہ اجتہاد سے کام لیا اور ایسی ایسی تحقیقات پیش کیں جن کو دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور غم وغصہ بھی، مثلاً انہوں نے کونوا قردۃً خاسئین کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ہوجاؤ بندروں کی طرح ذلیل وخوار، انسانیت کے رتبہ سے فروتر، انسانی مروت سیرت سے بعید''۔

اور اسی طرح ص ۲۶۱ پر فقال لهم الله موتوا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

''جبن وبزدلی کی وجہ سے تم پر موت طاری ہوگی یعنی دشمن تم پر غالب آئے گا اور فتح وظفر سے محروم ہو کر تم جیتے جی مرجاؤ گے۔ ثم احیاهم پھر ان کی بزدلی ختم کی گئی اور جہاد کی بے پناہ صلاحیتیں دے کر فتح وکامران کیا گیا کہ ان کا غلبہ واستیلاء ان کے لیے حیات نو کا مرادف بنے''۔

اور ایسے ہی ص ۲۶۵ پر او کالذی مر علیٰ قریة وهی خاویة علٰی عروشها کی تفسیر اور فخذ اربعة من الطیر کی تشریح انہوں نے بعینہ وہ کی جو ابومسلم اصفہانی معتزلی نے کی ہے۔ ص ۲۰۰ پر ورفعنا فوقكم الطور کی تشریحات کھلی ہوئی تفسیر بالرائے ہے۔

ہم نے سرسری طور پر ایک جائزہ لیا ہے ورنہ مطالعہ کرنے والے ''ترجمان القرآن'' کو تاویلات واجتہادات کا ایک دفتر پائیں گے۔ مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے ''ترجمان القرآن'' کی غلط اور نامناسب تحقیقات کے رد میں تفسیر لکھی جو ہمارے مطالعہ سے نہیں گزری، خیال یہی ہے کہ وہ اپنی شان میں مفید اور بارآور ہوگی۔ (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۵۷ء ص ۴۵، ۴۶)

نظریۂ وحدت ادیان

مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری فرماتے ہیں:

حدیث من قال لااله الاالله دخل الجنة کے ضمن میں علماء امت کی یہ تصریح

بھی سامنے آچکی کہ توحید کے ساتھ اقرار رسالت اوران تمام باتوں پر عقیدہ ضروری ہے جن کا ثبوت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے امت کو ضروری طور پر پہنچ گیا ہے اسی طرح یہ امر بھی سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ادیان وانبیاء علیہم السلام کی آمد حسب ضرورت وقت وزمانہ ہوتی رہی ہے اور بعد کے ادیان، سابقہ ادیان کے لیے ناسخ ہوتے آئے ہیں پھر سب سے آخر میں خاتم الانبیاء علیہم السلام کا سب سے زیادہ مکمل اورآخری دین آیا جس نے اس سے پہلے کے تمام ادیان کو منسوخ کردیا اوراعلان کردیا گیا: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا اورومن یبتغ غیرالاسلام دیناًفلن یقبل منه وهوفی الآخرة من الخاسرین (جو شخص اسلام کے سوا کوئی اوردین چاہے گا وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگا اورایسا شخص آخرت میں ناکام ونامراد ہوگا) اسی لیے کسی کا یہ خیال کرنا قطعاً غلط اور گمراہ کن ہوگا کہ:

''دنیا کے موجودہ دین سب حق پر ہیں اوراگر ہردین والا اپنے دین کے صحیح اصولوں پر عمل کرلے تو وہ ناجی ہے''۔

اول توادیان سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصل حالت پر باقی نہیں رہا،اور بالفرض اگر ہو بھی تو وہ آخری دین خاتم الانبیاء کے ذریعہ منسوخ ہو چکا، پھراس بات کی کیا قدروقیمت ہے کہ اپنے اپنے دینوں کی صداقتوں پر عمل کرلینا نجات اخروی کے لیے کافی ہے، ایسے ہی غلط نظریات کے تحت شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں ''وحدت ادیان'' کا خاکہ بنا کر اس کو عملی منصوبہ بنانے کی سعی ناکام ہوئی تھی۔

ترجمان القرآن کا ذکر

ہمارے زمانہ میں اسی کی ایک شکل کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں آیت اهدنا الصراط المستقیم کے تحت اپنے خاص انداز میں پوری قوت کے ساتھ پیش کیا، جس کو پڑھ کر گاندھی جی نے لکھا تھا کہ:

''مجھے مولانا صاحب کی تفسیر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ صداقت تمام ادیان میں مشترک ہے یہی نظریہ میرے نزدیک بھی صحیح ہے''۔

لیکن چونکہ مولانا آزاد کی اس قسم کی تعبیر اصول ونظریات اسلام کے خلاف تھی اس کی مفصل تردید رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں شائع ہوگئی تھی۔

پھر ایک ندوی عالم نے ہفتہ وار اخبار ''الفتح'' مصر میں ایک مضمون عربی میں شائع کیا جس میں تفسیر مذکور کی ضرورت سے زائد مدح سرائی کی، تو اس کی تلافی کے لیے رفیق محترم حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری حال شیخ الحدیث وناظم جامعہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی نے مقدمہ ''مشکلات القرآن'' میں تفسیر مذکور پر محققانہ تنقید کی جو عربی زبان میں بہت عرصہ ہوا مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی تھی۔

مولانا موصوف نے نہ صرف اس نظریہ کی غلطی پر کافی لکھا تھا بلکہ تفسیر مذکور کی دوسری بہت سی اغلاط کی بھی نشاندہی کردی تھی، جس کو پڑھ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مولانا بنوری کو تائید وتحسین کے طور پر ایک مکتوب بھی لکھا تھا، اس محققانہ تنقید کا اردو ترجمہ چند سال قبل ایک عالم دین نے رسالہ ''دارالعلوم دیوبند'' میں شروع کیا تھا جس کی اشاعت مولانا آزاد مرحوم نے رکوادی تھی، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔(انوار الباری ج۱ص۱۷۹)

مولانا آزاد مرحوم کے بارہ میں اوپر کی تحریر سے صرف مذہبی وعلمی لحاظ سے نامعیاری شان کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کی سیاسی ملکی وقومی خدمات کی نہایت اعلیٰ معیاری شان کا انکار کسی طرح نہیں، بلکہ ان کی گرانقدر خدمات کا نہ صرف اعتراف بلکہ زیادہ سے زیادہ ہمارے دل میں قدر ومنزلت بھی ہے، حق تعالیٰ ان کی زلات کو معاف فرمائے، گاندھی جی کی طرح ہمارے بہت سے مسلمان بھائی بھی خصوصاً کانگریسی تعلیم یافتہ حضرات ان کی شائع شدہ تفسیر وغیرہ سے غلط تاثرات لیتے ہیں اس لیے اتنی صراحت یہاں کردی گئی

حسب ضرورت آئندہ بھی لکھا جائے گا تاکہ دینی وعلمی تحقیق کا بلند معیار شخصیت کے غلط تجاوز سے آزاد رہے، واللہ الموفق۔ (انوار الباری ج ا ص ۱۸۱)

''انوار الباری'' ج ا ص ۱۷۹ تا ص ۱۸۱ حاشیہ میں مولانا بجنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''چند تعبیرات ملاحظہ ہوں'' کا عنوان قائم کرکے ''ترجمان القرآن'' ص ۱۸۰ ج ا (مطبوعہ زمزم کمپنی لاہور) میں الہدیٰ کے تحت دی گئی سرخی ''وحدت دین کی اصل عظیم اور قرآن حکیم''، وغیرہ آٹھ عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ چند نمونے ہیں، اسلامی عقائد واعمال کے بارہ میں مولانا کا ایک خاص نظریہ تھا جس کی جھلک یہاں دیکھی گئی اور بعض اہم امور دینی کے متعلق خود راقم الحروف کی مولانا مرحوم سے مکاتبت بھی رہی ہے اور مولانا کی تحریریں محفوظ ہیں، حسب ضرورت ان کی بھی اشاعت ہوسکتی ہے''۔ (حاشیہ ص ۱۸۱ ج ا)

''ترجمان القرآن'' کی ان تعبیرات اور ان پر علماء کرام کی تنقیدات کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (اہل حدیث) اپنی تفسیر ''واضح البیان فی تفسیر ام القرآن'' میں ''مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اور صراط مستقیم'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام صاحب نے ''ترجمان القرآن'' میں آیت اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر بہت بسط سے لکھی ہے، اس میں شک نہیں کہ زور کلام اور عبارت آرائی میں مولانا ممدوح کا انداز بیان ایک خاص وقعت رکھتا ہے گو بیان بہت طویل اور اس میں تکرار بکثرت ہے لیکن پھر بھی اس میں بہت سے قیمتی جواہر بھی ہیں جن کی قدر اہل ذوق کا کام ہے۔ (فجزاہ اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء)۔

ہاں اس میں بعض عبارات ایسی خطرناک بھی ہیں کہ ان کا مفہوم وہی ہے جو بعض احباب نے سمجھا ہے تو یہ اس دور آزادی میں اسلام کے لیے سخت صدمہ کا باعث ہے۔

''ترجمان القرآن'' کی طباعت سے تھوڑی مدت بعد مجھے لاہور سے ایک عزیز نے بعض دیگر احباب کے مشورہ سے لکھا کہ میں ''ترجمان القرآن'' کو ص ۱۲۸ سے ص ۱۶۹ تک بغور مطالعہ کر کے اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کروں کہ مولانا صاحب کا مقصود یہی ہے کہ:

''کوئی ہندو یا عیسائی اپنے دین کی حقیقت (توحید الٰہی اور اعمال صالحہ) معلوم کر کے اس پر قائم ہو جائے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول من عند اللہ نہ قبول کرتا ہو آپ کی بعثت کا شکریہ صرف اسی قدر ادا کر دے کہ مجھے اپنے دین کی اصل حقیقت معلوم ہوگئی ہے تو کیا ہم مسلمان اس کے بعد کسی کو اسلام کی دعوت دے سکیں گے وھٰکذا''۔

میں نے ان احباب کی فرمائش کی تعمیل کی، لیکن اس کے متعلق احتیاطاً اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے صرف اتنے الفاظ پر اکتفا کی کہ:

''مولانا صاحب کے کلام میں مرزا صاحب قادیانی کے دعوت نبوت کی طرح ہر دو پارٹیوں کے لیے کافی مسالہ (مصالح) ہے ایک بھولا بھالا مبلغ اسلام ''ترجمان القرآن'' کو ہاتھ میں لے کر قرآن مجید اور نبوت محمدی کے کمالات بھی پیش کر سکتا ہے، اور ایک شوخ و شاطر غیر مسلم بھی خدا کی توحید کا قائل ہوتا ہوا اور اپنی روش آزادی کو عمل صالح سمجھتا ہوا کہہ سکتا ہے کہ بے شک قرآن مجید ایک علمی کتاب ہے اس کی نصائح بہت عمدہ ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ کی بہت سی تاریکیاں دور کیں اور اخلاق کی بھی اصلاح کی۔ بس آپ کی بعثت سے یہی منشاء تھا کسی خاص گروہ میں شامل ہونا آپ کی رواداری اور وسیع الظرفی کے خلاف ہے بلکہ آپ نے اور قرآن مجید نے تحزب تشیع کو اسباب فساد و تخریب میں شمار کیا ہے اس لیے ہم کسی خاص گروہ میں شامل نہیں ہو سکتے''۔ (وھٰکذا)

لیکن میں (خاکسار میر سیالکوٹی) یہ بدگمانی بھی نہیں کر سکتا کہ ایک مسلمان عالم قرآن (مولانا آزاد صاحب) غیر مسلم دنیا کے سامنے یہ نظریہ پیش کرے کہ تم خدارسی کے

لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستغنی رہ سکتے ہو، اس لیے میں نے اپنی رائے رکھی اور اس میں جلدی نہیں کرنا چاہتا۔ (ص ۴۵) اس لیے ان عبارات مشکوکہ کی بابت خود ان سے دریافت کرلوں کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟ سو میں نے مولانا صاحب کی خدمت میں اس مضمون کا خط لکھا کہ آپ کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں آیت اھدنا الصراط المستقیم کے ذیل میں بعض عبارتیں ایسی سمجھی گئی ہیں جن سے آپ کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسے شخص کے لیے کہ وہ:

(۱) اسلام سے پیشتر کے کسی مذہب کی اصلی تعلیم پر قائم ہوکر ایمان باللہ و اعمال صالحہ کا مالک۔

(۲) بشرطیکہ وہ کسی نبی خاص کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب نہ کرتا ہو، اگرچہ آپ کے رسول من عنداللہ ہونے کے اقرار کو نجات کے لیے ضروری بھی خیال نہ کرتا ہو۔

(۳) قرآن مجید کے اوامر ونواہی کا وہ نصاب جو جملہ مذاہب میں مشترک ہے اپنے دین کی رو سے اس کا پابند ہو اور اسلامی نماز روزہ اور حج وغیرہ عبادات کو منہاج شریعت سمجھتا ہو جو پہلے مذہبوں سے صرف صورۃً مختلف ہیں نہ کہ اصل مقصد میں اور ان عبادات کا پابند نہ ہو کہ ان کو بھی جائز جانتا ہو نہ واجب۔

(۴) قرآن مجید کی اصلاح وتعلیم کی قدر کرتا ہو لیکن اسے منزل من عنداللہ نہ مانتا ہو، آپ ایسے شخص کے لیے دین محمدی میں داخل ہونا ضروری نہیں جانتے اور آپ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد بھی اس کی نجات اخروی اس کے مذہب کے مطابق عمل کرنے سے ہوسکتی ہے بلکہ ہوجائے گی۔ اور آپ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے معنیٰ بدرجہ کفایت اسی قدر ہیں کہ کوئی آپ کی تعلیم سے مذاہب سابقہ کی اصل حالت کو سمجھ کر اس پر قائم ہوجائے اور بس۔ کیا محولہ بالا (مندرجہ ترجمان القرآن) میں آپ کا مطلب یہی ہے؟.....۔

آج ۲۱؍جولائی ۱۹۳۴ء تک اس قصے کو کئی مہینے گزر گئے نہ میرا خط واپس آیا نہ جواب ملا اور میرا ظن غالب یہی تھا کہ مولانا صاحب اس کا صاف جواب ہرگز نہیں دیں گے، کیونکہ جیسا کہ میرا خیال ہے مولانا صاحب نے یہ مسئلہ کسی مصلحت کے لیے نہایت احتیاط سے بےضرورت طوالت اور ملول کن تکرار سے پیچیدہ عبارت میں لکھا ہے وہ اسے کبھی بھی واضح نہیں کریں گے ....لیکن پھر بھی اس کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے عنداللہ وعندالناس بری الذمہ ہونے کے لیے مولانا صاحب سے استفسار کر لینا ضروری خیال کیا جو باتیں ہم نے مولانا آزاد صاحب کے خط میں لکھی ہیں وہ سب آج کل محض آزاد وکج فہم بےعلم وعمل انگریزی دانوں میں گشت کر رہی ہیں۔ (ص۳۵۳)

قرآن کریم سے کسی نئے نظریہ کو سمجھنے اور اس کی صحت وسقم کے لیے معیار یہ ہے کہ وہ سلف صالحین کے مسلمہ مفہوم کے خلاف نہ ہو۔

مولانا میر سیالکوٹی لکھتے ہیں:

''اگر کہا جائے کہ حضرت مولانا صاحب ....صرف اسی حقیقت کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم نے تعلیم کی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ حقیقت ایسی واضح تھی تو کیا سبب ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال تک یہ حقیقت کسی صحابی، کسی تابعی، کسی امام ومجتہد، کسی محدث، کسی فقیہ، کسی متبع سنت متکلم، کسی صاحب کشف والہام عارف ولی اللہ پر نہ کھلی، اگر یہ حقیقت واضح تھی تو سب مسلمانوں کو اس کا علم ہوتا اور اسی پر سب کا اعتقاد ہوتا۔ اور اگر کوئی ایسی باریک گرہ تھی جسے صرف نہایت باریک بین اور حقیقت شناس افراد ہی کھول سکتے ہوں تو ایسے بڑے بڑے کامل بزرگوں میں سے جو آسمان علم وعمل اور ایمان وعرفان کے آفتاب ومہتاب ہوئے ہیں، اسے کوئی بھی نہ کھول سکا۔ اور اگر کہا جائے کہ اس معما کا حل قدرت نے صرف مولانا کے لیے ودیعت کر رکھا تھا ان سے پہلے جملہ کاملین لکیر کے فقیر ہوتے رہے ہیں تو بلانزاع فیصلہ کی یہی بات

ہے کہ ہمیں اسی لکیر پر چلنا چاہیے جو صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین اور صالحین امت کھینچ گئے ۔دیکھیے !زیر تفسیر یہی آیت ہے صراط الذین انعمت علیھم (الفاتحہ) یعنی خداوندا! ہمیں اس راستے کی رہنمائی کر اور اس پر چلنے کی توفیق عنایت فرما جو تیرے منعم لوگوں کا ہے۔اور معلوم ہے کہ اس امت محمدیہ میں وہ لوگ ہیں جن کے علم وعمل اور ایقان وعرفان کو ہم مولانا صاحب کے مقابلہ میں پیش کر رہے ہیں اور ان میں اور مولانا صاحب میں ازروئے علم وعمل واخلاص زمین وآسمان کا فرق ہے''۔(ص ۳۵۵)

اصول ترجمہ وتفسیر

خود مولانا صاحب نے ''ترجمان القرآن'' کے مقدمہ میں بضمن عنوان ''اصول ترجمہ وتفسیر'' متاخرین مفسرین پر بڑا اعتراض یہی کیا ہے کہ انہوں نے اپنی تفاسیر میں سلف صالحین کے اصول کو ملحوظ نہ رکھا اور قرآن کو وضعیت وصناعیت کے مصنوعی لباس میں چھپا دیا چنانچہ ان کی بعض تصریحات حسب ذیل ہیں:

(۱) سلف کی طبیعتیں وضعی طریقوں میں نہیں ڈھلی تھیں ،اس لیے وہ قرآن کی سیدھی سادھی حقیقت بے ساختہ پہچان لیتے تھے لیکن خلف کی طبیعتوں پر یہ بات شاق گزرنے لگی کہ قرآن اپنی سیدھی سادھی شکل میں نمایاں ہو۔ان کی وضعیت پسندی اس پر قانع نہیں ہوسکتی تھی۔

(۲) یہی زمانہ ہے جب امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تفسیر کبیر لکھی اور پوری کوشش کی کہ قرآن کا سراپا اس مصنوعی لباس وضعیت سے آراستہ ہوجائے۔

اگر امام رازی کی نظر اس حقیقت پر ہوتی تو ان کی پوری تفسیر نہیں تو دوتہائی حصہ یقیناً بے کار ہوجاتا۔(ص ۱۱ج۱)

مولانا میر سیالکوٹی کا تبصرہ

مولانا آزاد صاحب نے امام رازی پر نہایت کرم فرمائی کی کہ ان کی بے مثل تفسیر

کی ایک تہائی کو محض اپنی مہربانی سے کسی قدر کار آمد کہہ دیا۔ (ص ۳۵۶)

امام رازی نے توضعیت وصناعیت کے لباس میں بھی سلف صالحین کے سے ایمان کو نہیں چھوڑا لیکن حقیقت شناسی کے ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ وہاں جا کر سلف صالحین کا دامن صاف صاف ہاتھ سے چھوٹ گیا ع ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است (ص ۳۵۸)

مولانا آزاد لکھتے ہیں:

جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی، جنہوں نے صاحب کتاب سے مطلب سمجھا ہو۔ قرآن تیئیس برس کے اندر بتدریج نازل ہوا، وہ جس قدر نازل ہوتا تھا صحابہ کرام سنتے تھے، نمازوں میں دہراتے تھے اور جو کچھ پوچھنا ہوتا تھا خود پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھ لیتے تھے، ان میں بعض افراد خصوصیت کے ساتھ فہم قرآن میں ممتاز ہوئے اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی شہادت دی، مذہبی جوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا، بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری مؤثرات کے ماتحت نئی نئی کاوشیں شروع کر دیں اور سلف کی صریح تفسیر کے خلاف ہر گوشے میں قدم اٹھا دیے۔ (ص ۱۲ ج ۱)

مولانا میر سیالکوٹی فرماتے ہیں:

مولانا آزاد صاحب کی ان تصریحات سے بغیر کسی قسم کی کھینچ تان کے صاف روشن ہے کہ آپ قرآن شریف کی تفسیر میں سلف صالحین کو نمونہ مانتے ہیں اور انہی کو حقیقت شناس سمجھتے ہیں، آمنا و صدقنا۔

اب سوال یہ ہے کہ صراط مستقیم کی تشریح وتعیین میں جناب مولانا صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ اسلام کی حقیقت پر راجہ رام

موہن رائے بنگالی کے برہم سماج کی جو رنگت چڑھا رہے ہیں اس رنگ سازی میں سلف صالحین میں سے آپ کے ساتھ کون ہے؟۔

تفصیل الکلام علی تفسیر ابی الکلام

اس کے بعد مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن میں سے بعض ایسے مقامات نقل کیے جاتے ہیں جن سے مولانا ممدوح کے خصوصی نظریات واضح ہوتے ہیں۔

مولانا آیت اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر کے ضمن میں سورۂ مائدہ کی آیت لکل جعلنامنکم شرعة ومنھاجا نقل کر کے لکھتے ہیں:

(۱) اس آیت پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو، قرآن کا جب ظہور ہوا تو دنیا کا یہ حال تھا کہ تمام پیروان مذہب، مذہب کو صرف اس کے ظواہر و رسوم ہی میں دیکھتے تھے اور مذہبی اعتقاد کا تمام جوش و خروش اسی طرح کی باتوں میں سمٹ آیا تھا۔ ہر گروہ یقین کرتا تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم ہے کیونکہ وہ دیکھتا تھا دوسرے کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل و حقیقت ہیں نہ ان کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچا ہے مگر رواج و حقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے۔ یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو، یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اور چونکہ یہ اصل دین ہے، اس لیے نہ تو اس میں تغیر ہوا، نہ کسی طرح کا اختلاف رونما ہوا۔ اعمال و رسوم فرع ہیں، اس لیے ہر زمانہ اور ملک کی حالت کے مطابق بدلتے رہے، الخ۔ (۱۸۹)

(۲) اگر خدا چاہتا تو تمام نوع انسانی کو ایک ہی قوم و جماعت بنا دیتا اور فکر و عمل کا کوئی اختلاف وجود میں نہ آتا لیکن معلوم ہے کہ خدا نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی حکمت کا

مقتضا یہی ہو کہ فکر وعمل (۱) کی مختلف حالتیں پیدا ہوں۔ (۱۸۹)

مولانا میر سیالکوٹی لکھتے ہیں:

یہ جو آپ نے فرمایا کہ اصل دین ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی ہے، بالکل درست ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ خدا کی عبادت کا طریق اور نیک عملی کی زندگی خدا تعالیٰ کے ہاں وہی مقبول ہے جو اس کے نبی برحق کی معرفت تعلیم کی گئی ہو۔ ورنہ سلسلۂ رسالت ونبوت کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ پس اگر خدا تعالیٰ نے کسی سابق نبی کی شریعت کا کوئی طریق بتقاضائے مصلحت وقت کسی متأخر نبی کی معرفت منسوخ کر دیا۔ یا اس میں کوئی تبدیلی کر دی تو خدا کی خوشنودی اور اس کی درگاہ میں قبولیت اسی متأخر نبی کی پیروی سے حاصل ہوگی نہ کہ منسوخ شدہ شریعت کی پیروی سے۔

لہٰذا آپ کے اقوال مثلاً (قرآن شریف۔ ناقل) ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر جسے تم نے طرح طرح کی تحریف اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے پر سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ، وہ کہتا ہے اگر تم نے ایسا کر لیا تو میرا کام پورا ہو گیا۔ (ترجمان ص ۲۰۵ ج ۱)

(۲) اور یہ کہ (قرآن شریف نے۔ ناقل) جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا ہے تو یہی کہا ہے کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقیت از سرنو تازہ کر لو۔ تمہارا ایسا کرنا ہی مجھے قبول کر لینا ہے۔ (ترجمان ص ۲۱۱ ج ۱) وغیرہ وغیرہ۔ سب کے سب قرآنی دعوت کے برخلاف ہیں اور چونکہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری شریعت اور سب شرائع سابقہ کی ناسخ ہے۔ اس لیے اس وقت خدا کی رضامندی شریعت محمدیہ کی پیروی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کہنا بے معنیٰ ہوگا۔ (والعیاذ باللہ) گو اس مضمون کی

....

(۱) اس تشریح پر آگے کلام آ رہا ہے۔ ش

آیات بکثرت ہیں، لیکن ہم مثال کے طور پر صرف ایک آیت ذکر کر کے اس بات کو سمجھائے دیتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے سورۂ نور پ ۱۸ میں فرمایا:

واقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ واطیعوا الرسول لعلکم ترحمون (نور) یعنی نماز اور زکاۃ ادا کرتے رہو اور اس رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو اور امید رکھو کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس جگہ الرسول سے مراد آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس ہے اس آیت میں خدا تعالیٰ نے نماز کے قائم رکھنے، زکاۃ کے ادا کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے کا حکم کیا ہے اور ان احکام کی تعمیل پر رحمت کی امید دلائی اور معلوم اور مسلم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی ایک خاص صورت اور ہیئت اور زکاۃ کا ایک خاص نصاب اور طریق ادا تعلیم کیا ہے۔ اچھا اگر اب کوئی یہودی یا عیسائی نماز اور زکاۃ کے متعلق اس حکم اطیعوا الرسول کو نظر انداز کرتے ہوئے نسخ قبلہ صخرہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے جدا ہو کر اور کعبۃ اللہ سے منہ موڑ کر صخرۂ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ نصاب اور طریق ادا کو چھوڑ کر زکاۃ ادا کرے تو کیا آپ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع و فرمانبردار قرار دے سکیں گے؟ اگر نہیں دے سکیں گے تو اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر سچائی سے کاربند ہو جانے کی اجازت کے کیا معنی؟ اور اگر دے سکیں گے تو ان امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کہاں ہوئی جو خدا تعالیٰ نے بالتخصیص فرمائی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے طریق خاص کی طرف دعوت دے سکنے کا حق کیسے رہا؟۔ (ص ۳۶۱)

(۲) اور ص ۱۸۹/ ا پر آپ نے جولیبلو کم کے مفہوم میں فکر و عمل کی مختلف حالتیں لکھ کر لفظ فکر کو مفہوم قرآنی پر بڑھایا ہے اس سے مقصود قرآن میں بہت تغیر پیدا ہو گیا ہے اور

اس آیت کا جو ترجمہ(۱) آپ نے (اسی صفحہ)۱۸۹/۱ پر ارقام فرمایا ہے تشریح اس سے بہت دور جا پڑی ہے اور آپ کی اس تحریر کے ماتحت ہوگئی ہے جو آپ نے اصول ترجمہ وتفسیر کے ضمن میں ص ۱۷ پر لکھی ہے کہ تفسیر بالرائے سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے‘‘۔(۱/۱۵)

قرآن شریف کا مقصود وہی ہے جو آپ نے ترجمہ میں لکھا کہ (ہر وقت وحالت کے مطابق) تمہیں جو احکام دئے گئے ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرے۔(۱/۱۸۹) لیکن اس کی تشریح میں لفظ فکر کو داخل مفہوم قرآنی کر کے آپ قرآن شریف کو کھینچ تان کر اپنی کانگریسی ذہنیت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، جو درست نہیں اور اسی طرح (۱/۱۹۰) میں آیت سورۃ یونس پارہ (۱۱) ولو شاء ربك لآمن،الایة۔ کے ترجمہ میں بین القوسین جو یہ بڑھایا ہے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے) اور اس کی تشریح میں جو آپ نے فرمایا ہے پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس بارہ میں تحمل اور رواداری اپنے اندر پیدا کرو۔(۱/۱۹۱)

آپ کی ایسی سب تحریریں کتاب اللہ میں زیادتی اور قصر نبوت پر کاری ضرب ہے اور یہ سب کانگریسی ذہنیت کا اثر ہے۔اللھم اغفر۔(۳۶۳)

تصریح نمبر۲

مولانا آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن‘‘ص ۲۰۱ پر ایک بغلی سرخی’’قرآن کی دعوت‘‘

---

(۱)وہ ترجمہ یہ ہے:’’لیکن یہ اختلاف اس لیے ہوا کہ (ہر وقت وحالت کے مطابق) تمہیں جو احکام دیے گئے ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرے‘‘۔

مقصود قرآنی تو مختلف وقت میں مختلف احکام کی تشریع سے آزمائش کرنا ہے، لیکن تشریح میں فکری اختلاف کو بھی داخل کر دیا گیا۔ش

کے تحت بعض ایسی آیتیں نقل کی ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تیری طرف اسی طرح وحی کی ہے جس طرح تجھ سے پہلے انبیاء کی طرف تھی اور نیز یہ کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو بھی ان انبیاء کی ہدایت کی پیروی کر۔

مولانا آزاد صاحب ان آیات سے اپنے ٹھانے ہوئے مقصود کو ذہن میں رکھ کر اور مقصود خداوندی کو ایک طرف رکھ رقم طراز ہیں:

''اسی لئے اس (قرآن شریف) کی دعوت کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام بانیان مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے، سب خدا کی سچائی کے پیغمبر تھے سب نے ایک ہی اصل وقانون کی تعلیم دی سب کی متفقہ تعلیم پر کاربند ہونا ہی ہدایت وسعادت کی تنہا راہ ہے''۔ (۱/۲۰۲)

مولانا آزاد نے ''متفقہ تعلیم'' کے الفاظ اور جگہ بھی دہرائے ہیں اور اس مضمون کو حسب عادت بتکرار بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو ۱/۲۰۱ سطر ۴ اور ۱/۲۰۵ سطر ۱۰ وص ۲۰۹، ۲۱۳ ضمن و۔

مولانا میر سیالکوٹی کا تبصرہ

سب کی متفقہ تعلیم سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اگر سب کا مشترکہ نصاب تعلیم مراد ہے یعنی دین وشریعت کا وہ حصہ جو سب میں مشترک ہے مراد ہے تو سوال یہ ہے کہ بعض وہ امور جو ایک شریعت میں بوجہ عدم اقتضائے وقت ومصلحت تعلیم نہیں کئے گئے اور اس سے بعد کی شریعت میں کئے گئے یا کسی پہلی شریعت میں تعلیم تو کئے گئے لیکن اس سے پچھلی شریعت میں بنابر حکمت ومصلحت منسوخ کر دئے گئے جیسے مولانا آزاد بھی آیت ما ننسخ من آیۃ، الآیۃ۔ (بقرہ پارہ۱) کے ترجمہ پر بغلی تشریح میں تسلیم کرتے ہیں (۱) ان کی تصدیق

(۱) ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت کا ظہور اس لئے ہوا کہ یا تو نسخ کی حالت طاری ہوئی یا نسیان کی الخ (ترجمان القرآن ص ۱/۲۴۷) ش

وتعمیل واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر واجب نہ ہوگی تو ان کے نازل کرنے سے کیا فائدہ اور شریعت کی تکمیل وارتقا جن کا ذکر آپ ص(۲۰۴) (۱) کی بغلی تشریح میں کرتے ہیں کس طرح متصور ہوگا؟ اور اگر واجب ہوگی (جیسا کہ فی الواقعہ ہے) تو مصدقین مؤمنین کے مقابلہ میں جو لوگ اس نسخ واضافہ کے قائل نہ ہوکر اپنی پہلی شریعت پر قائم رہیں گے ان کا حکم کیا ہوگا؟ مثلاً اگر بالفرض یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس اصل توریت وانجیل جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں موجود بھی ہوں (جو واقعہ میں نہیں ہیں) اور حضرات موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی سیرت وطریق عمل پوری حفاظت سے اور معتبر وسائل سے ان کے پاس مکتوب ومحفوظ بھی ہو (جو واقعہ میں نہیں ہے) اس لئے کہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کامل ہے اور سب شرائع سابقہ کی ناسخ ہے ان یہود ونصاریٰ کو اس شریعت پر عمل کرنا واجب ہوگا یا نہیں؟ اگر واجب نہیں تو شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل وناسخ بنانے سے کیا حاصل، اور اگر واجب ہے تو اپنی اپنی شریعت پر قائم رہنے کی اجازت کے کیا معنیٰ؟....
تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ ان سب شرائع کو خواہ وہ برقرار ہوں خواہ منسوخ خدا تعالیٰ کی طرف سے منزل جانا جائے اور تعمیل کے معنی یہ ہیں کہ منسوخ کو ترک کر دیا جائے اور ناسخ پر عمل کیا جائے اور پہلی غیر کامل شریعت کے بعد دوسری کامل شریعت کے خداوندی اضافات کو قبول کر کے ان پر بھی عمل کیا جائے یہ صورت آپ کے ذہن شریف میں آجائے تو آپ کے سامنے سوائے امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلاۃ والتحیۃ) کے کوئی جماعت بھی صحیح معنوں میں خدا کی پرستار اور اس کی شریعت کی تابعدار نظر نہ آئے۔ یہی صحیح ایمان کی صورت ہے اور یہی سعادت ونجات کی حقیقی راہ ہے اور بس۔ (ص ۳۶۶)

یہ بات تو درست ہے کہ تمام پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کے متعلق یہ تصدیق اور

....

(۱) ص ۲۴۸ / مطبوعہ زمزم کمپنی لاہور۔ ش

یقین کیا جائے کہ وہ سب حق پر تھے اور سب خدا تعالیٰ کی سچائی کے پیغامبر تھے مگر مولانا آزاد نے آگے یہ کہہ کر کہ ''سب کی متفقہ تعلیم پر کاربند ہونا ہی ہدایت وسعادت کی حقیقی راہ ہے'' ہدایت وسعادت کی راہ کو آسمانی تمام مذاہب کی متفقہ تعلیم پر کاربند ہونے میں منحصر کردیا مگر جو تعلیمات ہر مذہب آسمانی کو متفقہ نہیں دی گئیں اور وہ تمام مذاہب سماوی میں مشترک نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ دی گئیں اور جن خصوصیات سے ہر امت کو الگ الگ ممتاز و مخصوص فرمایا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر عمل کرنا ضروری نہیں ان پر عمل پیرا ہوئے بغیر ہی ہدایت وسعادت کی حقیقی راہ پر چلنے والا شمار ہوگا حالانکہ شریعت محمدیہ کے خصوصی احکامات پر عمل پیرا ہوئے بغیر ہدایت وسعادت کی حقیقی راہ کا دستیاب ہونا محال ہے۔

تصریح نمبر۳

مولانا آزاد تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں ص۲۰۶ پر رقم طراز ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان راست باز انسانوں کے ایمان وعمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی''۔(ص۲۰۶ ج۱)

اس کے بعد مولانا آزاد نے بعض ایسی آیتیں لکھی ہیں جو بعض اہل کتاب کی تعریف میں ہیں مثلاً لیسوا اسواء (آل عمران پارہ۴) اور منھم امۃ مقتصدۃ (مائدہ پارہ۶)

مولانا میر سیالکوٹی فرماتے ہیں:

مولانا نے اس مقام پر بھی عبارت ''مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی''۔ اپنے خاص مقصود یعنی اسلامی برہم سماج قائم کرنے کے خیال کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن شریف کی تصریحات کے خلاف از خود بڑھادی ہے کیونکہ ان آیتوں میں اور ان جیسی دیگر آیات میں جن میں اہل کتاب کی تعریف وارد ہے، ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو آنحضرت ﷺ پر

اور قرآن شریف پر ایمان لے آئے تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی یہود میں سے اور نجاشی اور اس کے ساتھی عیسائیوں میں سے۔

چنانچہ سورۂ مائدہ میں پارہ ہفتم کے شروع میں فرمایا: واذاسمعواماانزل الی الرسول تری اعینھم تفیض من الدمع مماعرفوامن الحق یقولون ربناآمنا فاکتبنامع الشاھدین۔ ومالنالانؤمن باللہ وماجاء نامن الحق ونطمع ان یدخلنا ربنامع القوم الصالحین (پارہ ۷) اور جب انہوں نے اس کلام کو سنا جو اس (حاضر الوقت) رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا گیا ہے تو تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھیں آنسو بہانے لگ گئیں اس وجہ سے کہ انہوں نے الحق کو پہچان لیا اور وہ بے اختیار بول اٹھے خداوندا ہم ایمان لے آئے ہیں پس ہم کو بھی شاہدوں میں لکھ لے اور (وہ یہ بھی کہنے لگے) ہمیں کیا ہے کہ ہم خدا تعالیٰ پر اور اس حق پر جو ہم کو آچکا ہے ایمان نہ لائیں اور ہم (کیوں) یہ توقع نہ رکھیں کہ ہمیں ہمارا پروردگار صالح قوم کے زمرے میں داخل کردے۔ یہ آیتیں باتفاق مفسرین حبشہ کے عیسائی نومسلموں کے حق میں نازل ہوئیں بلکہ خود مولانا آزاد صاحب بھی ان کے متعلق یہی فرماتے ہیں۔ چنانچہ آپ واذاسمعواماانزل الی الرسول کا ترجمہ یوں کرتے ہیں ''اور جب یہ (عیسائی) وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا، الخ''۔ (ترجمان ص ۴۲۹) اور ربنا آمنا کا ترجمہ یوں ارقام کرتے ہیں ''خدایا! ہم (اس کلام پر) ایمان لائے'' اور ان آیتوں کے متعلق بغلی تشریحات میں فرماتے ہیں:

''نجاشی حبش کا مسیح فرماں روا بغیر دیکھے ایمان لے آیا نجاشی کے علاوہ خود عرب میں بھی عیسائیوں کی بڑی تعداد ایمان لے آئی''۔ (ص ۴۲۹ ج ۱)

اس سے صاف روشن ہے کہ مولانا آزاد کے نزدیک ان آیات کے مصداق وہ عیسائی ہیں جو قرآن اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے تو سورۃ مائدہ کے ترجمہ کی ان تصریحات کے خلاف آپ نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں ان جیسی دیگر آیتوں

کی تشریح میں یہ الفاظ کیسے داخل کردیے کہ ان سے وہ لوگ مراد ہیں ''جو نزول قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہب کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی''۔(ص ۲۰۶)

مولانا آزاد نے سورۃ آل عمران پارہ ۴ کی جو آیت یعنی لیسوا سواء الخ۔ اپنے مطلب کے لئے پیش کی ہے اس کے اور پارہ ہفتم والی مذکورہ بالا آیت میں ایک خاص نکتہ ہے جو خدا کے فضل سے قارئین کرام کو کمال حظ ولطف دے گا اور وہ اس سے سراسر قائل ہوجائیں گے کہ ان ہر دو مقامات پر اور ان جیسے دیگر مقامات پر جن اہل کتاب کی مدح وتعریف ہے ان سے وہ افراد مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مقدس جماعت میں داخل ہوگئے تھے ان ہر دو مقامات کو پھر دیکھئے کہ ان ہر دو میں الصالحین کا لفظ وارد ہے اور ان صالحین سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں سورۃ مائدہ پارہ ۷ میں بتایا کہ یہ اہل کتاب آرزو رکھتے ہیں کہ وہ قرآن پر ایمان لاکر جماعت صالحین میں داخل ہوجائیں اور سورۃ آل عمران پارہ ۴ کی آیت میں بتایا کہ وہ ان صالحین میں شامل ہوگئے اور معلوم ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت ہی تھی جن میں وہ شامل ہونا چاہتے تھے اور بفضل خدا شامل ہوگئے۔(ص ۳۶۸)

ساتویں پارے کی مذکورہ بالا آیتوں کے ترجمہ کی بغلی تشریح میں مولانا آزاد عیسائیوں میں سے بڑی تعداد کے ایمان لے آنے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''لیکن یہودیوں کے جمود میں جنبش نہ ہوئی، وہ برابر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں خیبر سے جلاوطن کئے گئے''۔(ص ۴۲۹ ج ۱)

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا یہود میں سے کسی جماعت چھوٹی یا بڑی کے

مسلمان ہونے کے قائل نہیں ہیں اگر یہی مطلب ہے تو یہ واقعات کے خلاف ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن سلام جو علمائے یہود میں سے ایک خاندانی عالم تھے یہ خود اور ان کے ساتھ ایک جماعت یہود ایمان لے آئی تھی قرآن شریف میں ایسی جماعت کے ارشادات بکثرت ہیں اور تمام مفسرین بالاتفاق ان آیات کے ذیل میں حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کی تصریح کرتے ہیں۔

اور اگر مولانا کی یہ مراد ہے کہ بمقابلہ عیسائیوں کے یہود میں سے کم لوگ ایمان لے آئے تو اس سے بھی ہمارا اصل مقصود حاصل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے تھے خواہ تھوڑے تھے خواہ بہت تھے۔قرآن شریف نے خاص انہی کی تعریف کی ہے نہ ان کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاتے ہوئے توریت کی اصل تعلیم پر عمل پیرا رہے اور اپنے مذہب پر قائم رہے جیسا کہ مولانا کا خیال ہے، فافهم لعلك ترشد۔(ص۳۷۱)

تصریح نمبر۴

اس میں نہ تو کسی خاص نسل وقوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے نہ کسی خاص مذہب اور اس کے پیرووں کی دنیا کے تمام نبی تمام صدیق تمام شہدائے حق تمام صالح انسان خواہ کسی ملک وقوم میں ہوئے ہوں قرآن کے نزدیک ''انعام یافتہ'' انسان ہیں اور انہی کی راہ ''صراط مستقیم ہے'' (ص۲۱۶)

مولانا میر سیالکوٹی کا تبصرہ

آپ ایک خاص خیال کے پیچھے لگ کر ایک ضروری شرط کو نظر انداز کر رہے ہیں وہ یہ کہ کسی صاحب شریعت رسول کے بعد دوسرے صاحب شریعت کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے حسب مصلحت پہلی شریعت کا جو مسئلہ منسوخ کر دیا، یا اس پر کچھ اضافہ کیا تو پہلی شرط شریعت کے موجودہ لوگوں پر واجب ہے کہ پچھلی شریعت کے ایسے مسائل کو تسلیم کریں اور

ان پر حسب تعلیم نبی برحق عمل کریں ورنہ یہ نسخ واضافہ معاذ اللہ بے معنیٰ و بے سود ہوگا جیسا کہ ہم سابقاً ذکر کر چکے ہیں۔

اس شرط کو ملحوظ رکھ کر صورت مسئلہ یوں ہوئی کہ قرآن شریف ان سب گزشتہ صالحین کو صراط مستقیم پر جانتا ہے جو ہر نبی کے عہد میں خدا کی مقرر کردہ شریعت پر عمل پیرا رہے مثلاً قرآن شریف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ یہودیوں کی سرکشی کی وجہ سے بعض حلال اشیاء ان پر حرام کر دی گئیں اس وقت ان کو ترک کرنا ہی شریعت کی تابعداری تھی لیکن خدائے تعالیٰ کے علم وارادہ میں یہ حرمت حضرت عیسیٰ کی آمد تک تھی جب خدائے تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معرفت ان چیزوں کو حلال کر دیا تو اب ان کو حلال جاننا شریعت کی تابعداری تھی اور ان کی حرمت پر اڑا رہنا خدا کی شریعت کا انکار تھا چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ذکر کیا ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم فاتقوا الله واطیعون (آل عمران پارہ ۳) یعنی میں اس لئے بھی رسول ہو کر آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام کی گئی تھیں تمہارے لئے حلال کروں پس تم (ان میں) خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس آواز کو سن کر قبول کر لیا وہ خدا کے متقی وفرماں بردار ہیں اور جنہوں نے قبول نہ کیا وہ غیر متقی ونافرمان ہیں اسی طرح قرآن شریف کے نازل ہو جانے پر توریت وانجیل کے منسوخ مسائل پر اڑے رہنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اضافات کو قبول نہ کرنا تقویٰ وفرماں برداری کے خلاف ہے پس ایسے لوگ عنداللہ صالحین نہیں ہو سکتے خواہ وہ توریت وانجیل پر عمل پیرا رہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہودی یا عیسائی یا برہمو یا آریہ یا گاندھی جی اور ان کے رفقاء اگر قرآن شریف سے الگ رہ کر صالح بننا چاہیں تو آیا ان کی ایسی صلاحیت عنداللہ مقبول ہو جائے گی؟ اور خدا کے وعدہ کے مطابق نجات کے حقدار کہلا سکیں گے؟ اگر وہ قرآن شریف پر عمل کرنے کے بغیر نجات پا سکتے ہیں (معاذ اللہ) تو قرآن شریف کے لئے دعوت

کا دروازہ بند ہے اور اگر نہیں پا سکتے جیسا کہ امر واقعی ہے تو پھر مولانا آزاد کی یہ تطویل لا طائل ہے، فافہم۔

اللہ صد ہار حمتیں نازل کرے شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ پر جو یہ فرما گئے ۔

محال ست سعدی کہ راہ صفا　　　　تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

تصریح نمبر ۵

''بہر حال قرآن کریم کا پیرو وہ ہے جو دین کی سیدھی راہ پر چلنے والا ہے وہ راہ نہیں جو کسی خاص گروہ، کسی خاص نسل، کسی خاص قوم، کسی خاص عہد کی راہ ہے الخ''۔ (ص۲۱۸ ج۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''اگر مسلمان یہ کہیں کہ اس عہد محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں سعادت و نجات صرف قرآن و پیغمبر قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہے'' تو معاذ اللہ وہ قرآن کے پیرو نہ رہیں گے اور ان پر تحزب و تشیع کا فتویٰ جڑ دیا جائے گا اور ان کو دین قیم سے منحرف سمجھا جائے گا۔ عجیب تماشہ ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ نجات صرف قرآن و پیغمبر قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ہے وہ تو قرآن کا پیرو نہ سمجھا جائے اور جو یہ کہے کہ اس وقت (عہد محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں) وید (بالفرض) اور توریت اور انجیل اور زبور یہ کتابیں گو اصالۃ غیر مکمل تھیں اور اب اصالۃ موجود بھی نہیں ہیں اور قرآن شریف ہر چند کہ محفوظ ہے اور مکمل بھی ہے اور سب کتب سابقہ کا ناسخ بھی ہے امر اتباع میں سب برابر ہیں تو وہ قرآن کا پیرو سمجھا جائے، واللہ ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں یہ سمجھ مولانا صاحب ہی کو مبارک ہو۔ (ص۳۷۳)

مولانا آزاد کی ایسی بہت سی تصریحات ہیں جو ''ترجمان القرآن'' کے مطالعہ کرنے والوں کو قرآن سے آزاد کر دینے والی ہیں۔ (ص۳۷۴)

تصریح نمبر ۶

مولانا آزاد اسی آیت اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر کے ضمن میں سورۃ بقرہ

کی آیت ان الذین آمنوا والذین ھادو، الآیۃ۔ نقل کر کے اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''یعنی دین سے مقصود تو خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ تھی وہ کسی خاص حلقہ بندی کا نام نہ تھا کوئی انسان ہو کسی نسل وقوم سے ہو کسی نام سے پکارا جاتا ہو لیکن اگر خدا پرست اور نیک عمل ہے تو دین الٰہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لئے نجات ہے، الخ''۔ (۱۹۳ج ۱)

اس آیت کی پوری تفصیل آگے آرہی ہے مگر پہلے مولانا آزاد کے الفاظ ''کسی نام سے پکارا جاتا ہو'' کے متعلق اس وضاحت کو پیش نظر رکھئے کہ اس نام سے مولانا کی مراد ذاتی نام زید بکر وغیرہ نہیں بلکہ یہودی یا نصرانی یا مسلمان مذہبی نام مراد ہیں گویا مولانا کے نزدیک بتقاضائے وقال اننی من المسلمین (حم سجدہ پارہ ۲۴) اسلام کا اقرار کر کے مسلمان نہ بھی کہلاتا ہو تو وہ بھی نجات پا سکتا ہے۔ گویا حضرات موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی شریعت کے بعد برعایت مصلحت زمانہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں خدا کی وحی سے جس قدر اضافے کئے گئے اور پچھلی شریعتوں کے جس قدر مسائل منسوخ ہوئے جن کی تکمیل سے اس شریعت کو مکمل اور ہمیشہ کے لئے غیر مبدل کر دیا گیا اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم (مائدہ پارہ ٦) نازل کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کہا گیا معاذ اللہ وہ سب بے سود اور لاحاصل ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہودیت ونصرانیت پر قائم رہنا (گو ان کی حقیقی تعلیم موجود بھی ہو) آفتاب عالم کی موجودگی میں چراغ لے کر بیٹھنا ہے۔ صاحب توریت موسیٰ علیہ السلام بذات خود بھی تشریف فرما ہوں تو وہ بھی آنحضرت کی ذات اقدس سے نہ خود بے نیاز ہو سکتے ہیں نہ دوسروں کو بے نیاز کر سکتے ہیں یہی حال صاحب انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ وہ بھی آخر زمانہ میں آسمان سے نازل ہوں گے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی کریں گے کیونکہ یہ شریعت کامل وعالمگیر ہے اور تا قیام قیامت دائم وقائم رہنے والی ہے اور اس سے پیش تر کی سب شریعتیں خاص خاص امتوں اور مخصوص ومحدود زمانے کے لئے تھیں اور کامل بھی نہ تھیں (فافہم)

لہٰذا ہم آج محض یہودیت ونصرانیت پر یا معاذ اللہ ہندوازم پر (خواہ اصلی حالت پر ثابت بھی ہو جائیں) قائم ہو کر اور قرآن شریف اور سیرت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستغنی ہو کر نجات نہیں پاسکتے خدا تعالیٰ ہمیں اپنی صراط مستقیم کی سمجھ عطا فرمائیں، آمین۔ (واضح البیان ص ۳۶۵)

بعض لکھے پڑھے (۱) آزاد خیال لوگوں کا کہنا ہے کہ نجات اخروی کے لئے کسی معین گروہ میں شامل ہونا ضروری نہیں۔ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابی کسی نسل وقوم سے ہو کسی نام سے پکارا جاتا ہو، لیکن اگر وہ خدا پرست اور نیک عمل ہے تو دین الٰہی پر چلنے والا ہے اور اسی کے لئے نجات ہے ہر چند کہ ان کا یہ خیال ان کے اپنے دماغ کی تراش اور ان کے دل کی خواہش ہے لیکن غلط فہمی یا کج روی سے انہوں نے ایک آیت کو سہارا بھی بنایا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اس اعتقاد کی دلیل یہ آیت ہے: ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (بقرہ پارہ ۱) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی جو کوئی بھی خدا پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے پس ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر کسی طرح کا خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

یہ مضمون سورۃ مائدہ پارہ ٦ میں بھی وارد ہے وہ کہتے ہیں کہ ان ہر دو آیات میں خدا تعالیٰ نے صرف اپنی الوہیت پر اور روز آخرت پر ایمان رکھنے اور نیک کام کرنے پر اجرت دینے اور خوف وخطر سے امن میں رکھنے کا وعدہ کیا ہے اور کسی خاص یا عام نبی پر ایمان رکھنے

(۱) احقر کو بھی ایک ایسے ہی آزاد خیال آزاد صاحب سے متاثر ڈاکٹر سے ایسی ہی گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے وہ بھی اسی آیت کو اپنے اس غلط خیال کی دلیل میں پیش کرتے تھے کہ اس میں ایمان بالرسل کا ذکر نہیں کیا گیا۔ سید عبدالشکور ترمذی

کو اس فہرست میں شمار نہیں کیا بلکہ نجات اخروی کو مسلمانوں یہودیوں عیسائیوں اور صابیوں میں سے کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں کیا بلکہ اسے مشترک وراثت قرار دے کر ان سب کو اس میں برابر کا حصہ دار ٹھہرایا ہے بشرطیکہ وہ خدا تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان رکھیں اور نیک عمل کریں ان ہر دو آیات میں ایمان بالرسل مذکور نہ ہونے سے بعض خوش فہموں نے تو اسے فہرست امور ایمان سے کاٹ دیا لیکن مولانا آزاد ان سے بھی بڑھ کر آزادی سے کام لینا چاہتے ہیں کہ وہ اس آیت کو نقل کرنے کے بعد بضمن لفظ یعنی اس کا حاصل جو کچھ فرماتے ہیں اس میں ایمان بالآخرت کو بھی حذف کر دیتے ہیں جیسا کہ تصریح نمبر۶ کو ملاحظہ کرنے سے واضح ہے اس کو دوبارہ ملاحظہ کرلیا جائے۔

مولانا میر سیالکوٹی کا تبصرہ

اس آیت مذکورہ بالا سے بعض ان پڑھ مجتہدوں نے جو یہ سمجھ لیا کہ ''نجات کے لئے ایمان بالرسل ضروری نہیں صرف خدا پرستی اور نیک عملی کی ضرورت ہے چاہے کسی دین پر ہو کر کی جائے''۔(جیسا کہ ترجمان القرآن کی عبارت نمبر۶ سے ظاہر ہو رہا ہے) یہ درست نہیں انہوں نے بفحوائے حفظت شیئاو غابت عنك اشياء

قرآن شریف کی کثیر التعداد نصوص بینہ کو جو ایمان بالرسل کے متعلق ہیں نظر انداز کر دیا ہے۔

تفصیلی جواب

علاوہ ان آیات کے جو متفرق طور پر جا بجا قرآن مجید میں مذکور ہیں خاص اسی آیت کا ایک ایک امر انبیاء اللہ کی ضرورت کی شہادت دے رہا ہے لیکن دکھائی اسے دے جس کی آنکھیں ہوں اور سمجھے وہ جس کے دماغ میں ادراک ہو۔

اس کی تفصیل سمجھنے کے لئے ایک تمہید کی ضرورت ہے وہ یہ کہ علم بلاغت میں ایجاز واطناب دو اصطلاحیں ہیں ایجاز اختصار کو کہتے ہیں کہ مقصود کو کم تر عبارت میں پورا پورا ادا

کردیا جائے اوراطناب درازی کو کہتے ہیں کہ کسی فائدے اور نکتے کے لئے قدرے متعارف سے لمبی عبارت میں بیان کیا جائے اورقدرے متعارف عبارت میں بیان کیا جائے تو اسے مساوات کہتے ہیں ان ہرسہ کے قواعد کتب بلاغت میں مذکور ہیں اور قرآن مجید میں یہ ہرسہ وارد ہیں لیکن قرآن شریف کا غالب حصہ کلام موجز ہے کہ اس میں بلاغت کے جوہر سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں اورایجاز کی صورتوں میں سے ایک صورت حذف کی ہے کہ اگر کسی شئے کے وجود پر کوئی قرینہ عقلی یا نقلی یا حالی یا مقالی دلالت کرتا ہوتو ان قرائن پر اعتماد کر کے اسے عبارت میں ذکر کرنے کی بجائے حذف کردیا جاتا ہے کیونکہ اس میں علاوہ اختصار کے دماغ کا حظ بھی ہوتا ہے اورتصریح میں یہ حظ نہیں ہوتا اس کی مثالیں قرآن شریف میں بیش از بیش ہیں۔اس تمہید کوملحوظ رکھتے ہوئے اب گنتے جایئے کہ اسی آیت ان الذین آمنوا،الآیۃ میں ایمان بالرسل کے لئے کتنے قرینے ہیں سب سے اول یہ کہ قرآن شریف کی اس آیت کو آپ کلام اللہ ہونے کی حیثیت میں بطوردلیل پیش کررہے ہیں اورظاہر ہے کہ کلام اللہ کے ظہور کا ذریعہ صرف خدا کا رسول ہے یہ نہایت درجہ کی نادانی ہے کہ قرآن شریف کو کلام خدا تسلیم کرلینا اورحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ بھی مانے لیکن آپ کو رسول اللہ اعتقاد نہ کرے ؎ بریں عقل و دانش بباید گریست

دوم یہ کہ اس آیت میں جن فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب انبیاء علیہم السلام کی امتیں ہیں (علیٰ اختلاف فی الصابئین) آمنوا میں مسلمان دین محمدی والے ہیں، چنانچہ مولانا آزاد اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

(۱) جولوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہیں۔(ترجمان ص۱۹۳ ج۱)

(۲) جولوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لاچکے ہیں۔(ترجمان ص۲۳۷ ج۱)

(۳) جولوگ (قرآن پر) ایمان لائے ہیں۔(ترجمان ص۴۲۶ ج۱)

والذین ھادوا والنصاریٰ۔یہودونصاریٰ علی الترتیب حضرات موسیٰ علیہ السلام

اور عیسیٰ علیہ السلام کی امتیں ہیں والصابئین امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے ابوالعالیہ وغیرہ سے نقل کیا کہ صابئین اہل کتاب میں سے ایک گروہ تھا جو زبور کا قائل تھا اور قاموس میں کہا ہے کہ وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہم حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں اور حافظ ابن حزم رحمہ اللہ نے کتاب ''الفصل'' میں لکھا ہے کہ وہ صابئین اور مجوس بعض انبیاء کی تصدیق میں ہمارے ساتھ ہیں۔ (جلد اول ص ۹۸)

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ مذکورہ بالا سب فرقے انبیاء علیہم السلام کی امتیں ہیں خواہ کسی حال میں ہوں ان کے نام لیوا ضرور ہیں پس جس امر کا اقرار ان فرقوں کے نام میں ملحوظ ہے اس کا الگ ذکر کرنا ضروری نہ ہو، الہٰذا ایمان بالرسل فہرست ایمانیات سے خارج نہیں ہو سکتا۔

سوم یہ کہ اگر متکلم کسی جگہ اختصار کرے تو سب سے پہلے اس کی تفصیل اس کے اپنے کلام تصریحات میں تلاش کرنی چاہئیں، اس بنا پر ہم کو دیکھنا چاہئے کہ کلام خدا یعنی قرآن شریف اور نبی قرآن یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ کی تشریح کیا کی ہے؟

سو معلوم ہوا کہ قرآن شریف میں اس مضمون کی آیات بکثرت ہیں کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ایمان موجب نجات ہے، جو ان جملہ امور سے پاک ہو جو منافی ایمان ہیں اور جملہ ایمانیات پر شامل وحاوی ہو مثلاً شرک ایک ایسا امر ہے کہ اگر ایمان کے ساتھ مل جائے تو یہ پاک نہیں ہوگا البتہ ایمان برباد ہو جائے گا اسی طرح رسالت محمدی اور قرآن شریف پر ایمان لانے کی بابت فرمایا:

یاایھاالناس قدجاء کم الرسول بالحق من ربکم فآمنوا خیرلکم ۔سورۃ **تغابن میں فرمایا:** فآمنوابالله ورسوله والنورالذی انزلنا۔ (پارہ۲۸) **اس کے بعد فرمایا** ومن یؤمن بالله ویعمل صالحاًیکفرعنه سیأته ویدخله جنت تجری من تحتهاالانهارخالدین فیهاابدا (**تغابن پارہ۲۸**)

تنبیہ نمبر ا

اوپر کی آیات میں تین چیزوں پرایمان لانے کا حکم کیا خدا تعالیٰ ،اپنے رسول مقبول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر،اپنی پاک کتاب قرآن شریف پراس کے بعد دوسری آیت میں ایمان باللہ اورعمل صالح پرنجات اور جنت کا وعدہ کیا ہےاس سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر کے ایمانی امورایمان باللہ میں شامل ہیں ورنہ ایک آیت میں ایک چیز کاحکم دینا اور دوسری سطر میں اس حکم کونظرانداز اور فراموش کردینا لازم آئے گا اور خدا کا کلام اس سے پاک ہے۔

تنبیہ نمبر۲

سورۃ تغابن کے اس مقام میں ایمان کے امورصرف تین گنے ہیں یعنی خداتعالیٰ پرایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پرایمان اورقرآن شریف پرایمان اوراس جگہ یوم آخرت (قیامت)پرایمان لانے کا ذکرنہیں کیا تو کیا اس عدم ذکر سے یہ لازم آنا چاہئے کہ قرآنی نقطہ نگاہ میں یوم آخر پرایمان لانا ضروری نہیں؟ حالانکہ اس پرایمان لانا سورۂ بقرہ اورسورۂ مائدہ کی آیت زیربحث میں امورنجات کی فہرست میں داخل ہو چکا ہےتو جس طرح آپ سورۃ تغابن کی آیت میں حسب تصریح سورۂ بقرہ و مائدہ ایمان باللہ میں ایمان بالآخرت کوداخل فہرست سمجھتے ہیں اسی طرح حسب تصریح سورۃ تغابن وغیرہ ایمان بالرسل کوسورۂ بقرہ اور مائدہ میں بھی داخل سمجھیں پس خداتعالیٰ پرایمان اس کے رسولوں پرایمان لانے کے بغیر موجب نجات نہیں ہوگا واللہ الھادی''۔(ص۳۳۴)

چوتھا قرینہ اس آیت زیربحث یعنی ان الذین آمنواوالذین ھادوا میں انبیاءاللہ علیہم السلام پرایمان کے ضروری ہونے کا یہ ہے کہ اس میں روز قیامت پرایمان رکھنا ایمانیات وموجبات نجات میں شمار کیا گیا ہےاورروز قیامت پرایمان بغیر کسی رسول برحق کی تعلیم کے نہیں ہوسکتا کیونکہ اول تو قیامت کا واقعہ ہونا آئندہ پیش آنے والے امور میں سے

ہے اور اس کا علم خدا تعالیٰ کے بتانے کے بغیر نہیں ہوسکتا اور خدا تعالیٰ اپنے مغیبات سوائے انبیاء علیہم السلام کے کسی دیگر کے ذریعہ ظاہر نہیں کرتا دیگر یہ کہ قیامت کا تقرر خدا کے حکم سے ہے عقل سے نہیں ہے اور خدا کے تقرر کا علم بغیر کسی نبی برحق کے واسطے کے نہیں ہوسکتا یہ امر ایسا ظاہر ہے کہ اس پر کچھ اور لکھنے کی حاجت نہیں ۔پس انبیاء پر ایمان لانے سے مستغنی نہیں ہوسکتے اسی لئے قیامت پر ایمان سوائے انبیاء کی امتوں کے کسی کا نہیں۔

پانچواں قرینہ یہ ہے کہ امور نجات میں اعمال صالحہ کو بھی گنا ہے اور اعمال صالحہ کا علم اور تقرر اور ان کی عملی کیفیت بغیر نبی اللہ کی تعلیم وارشاد کے معلوم نہیں ہوسکتی اور نہ وہ طریق سنت کی موافقت کے بغیر موجب آخرت ہوسکتے ہیں لہٰذا ان کے ضمن میں بھی ایمان بالرسالۃ ملحوظ ہے اس لئے رسالت پر ایمان لانے کے سوا نجات نہیں ہوسکتی (واضح ص ۳۴۱)

تفسیر معارف القرآن

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی بے نظیر تفسیر ''معارف القرآن'' میں فرماتے ہیں:

''ایمان بالرسالۃ کے بغیر نجات نہیں: ظاہر ہے کہ اس آیت میں تمام ایمانیات اور عقائد اسلام کی تفصیلات بیان کرنا منظور نہیں، نہ اس کا کوئی موقع ہے اسلام کے چند بنیادی عقائد ذکر کرکے تمام اسلامی عقائد کی طرف اشارہ کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا مقصود ہے اور نہ یہ کوئی ضروری بات ہے کہ ہر آیت میں جہاں ایمان کا ذکر آئے اس کی ساری تفصیلات وہیں ذکر کی جائیں اس لئے اس جگہ ایمان بالرسول یا ایمان بالنبوۃ کا ذکر صراحۃً نہ ہونے سے کسی ادنیٰ فہم وعقل اور انصاف ودانش رکھنے والے کو کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی خصوصاً جبکہ پورا قرآن اور اس کی سینکڑوں آیتیں ایمان بالرسالت کی تصریحات سے لبریز ہیں جن میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ارشادات رسول پر مکمل ایمان لائے بغیر نجات نہیں اور کوئی ایمان وعمل بغیر اس کے مقبول ومعتبر نہیں

لیکن ملحدین کا ایک گروہ جو کسی نہ کسی طرح قرآن میں اپنے مکروہ نظریات کو ٹھونسنا چاہتا ہے اور انہوں نے اس آیت میں صراحۃ ذکر رسالت نہ ہونے سے ایک نیا نظریہ قائم کرلیا جو قرآن وسنت کی بے شمار تصریحات کے قطعاً خلاف ہے وہ یہ کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب یہودی نصرانی یہاں تک کہ ہندو بت پرست رہتے ہوئے بھی اگر صرف اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک کام کرے تو نجات آخرت کا مستحق ہوسکتا ہے ۔نجات اخروی کے لئے اسلام میں داخل ہونا ضروری نہیں ۔(نعوذ باللّٰہ منه)

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کی توفیق اور اس پر صحیح ایمان عطا فرمایا ہے ان کے لیے قرآنی تصریحات سے اس مغالطہ کا دور کردینا کسی بڑے علم ونظر کا محتاج نہیں ،قرآن کریم کا اردو ترجمہ جاننے والے حضرات بھی اس تخیل کی غلطی کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں ۔ چند آیات بطور مثال کے یہ ہیں قرآن کریم نے جس جگہ ایمان مفصل کا بیان فرمایا، اس کے الفاظ سورۃ بقرۃ کے آخر میں یہ ہیں کل آمنا بالله وملائکته و کتبه ورسله لانفرق بین احدمن رسله ۔سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اس طرح کہ اس کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے اس آیت میں واضح طور پر ایمان کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی واضح کردیا کہ کسی ایک یا چند رسولوں پر ایمان لے آنا قطعاً نجات کے لئے کافی نہیں بلکہ تمام رسولوں پر ایمان شرط ہے اگر کسی ایک رسول پر بھی ایمان نہ لایا تو اس کا ایمان اللہ کے نزدیک معتبر ومقبول نہیں دوسری جگہ ارشاد ہے:ان الذین یکفرون بالله ورسله ویریدون ان یفرقوابین الله ورسله ویریدون ان یتخذوابین ذٰلك سبیلاًاولٓئك هم الکافرون حقاً ۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کردیں کہ اللہ پر تو ایمان لائیں مگر اس کے رسولوں پر ایمان نہ ہو اور وہ یہ چاہیں کہ کفر وایمان کے بیچ بیچ کا ایک راستہ نکال لیں تو سمجھ لو کہ وہ ہی

اصل میں کافر ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لو کان موسیٰ حیالماوسعہ الا اتباعی ۔یعنی اگر بالفرض آج حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا تو اب کسی کا یہ کہنا کہ ہر مذہب والے اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں ۔تو بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور بغیر مسلمان ہوئے وہ جنت اور فلاح آخرت پاسکتے ہیں قرآن کریم کی مذکورہ آیات کی کھلی مخالفت ہے اس کے علاوہ اگر ہر مذہب وملت ایسی چیز ہے کہ اس پر ہر زمانہ میں عمل کرلینا نجات اور فلاح کے لئے کافی ہے تو پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن ہی بے معنیٰ ہوجاتا ہے اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت بھیجنا فضول ہوجاتا ہے ۔سب سے پہلا رسول ایک شریعت ایک کتاب لے آتا وہ کافی تھی دوسرے رسولوں ،کتابوں ،شریعتوں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کا وجود کافی ہوتا جو اس شریعت وکتاب کو باقی رکھنے اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کا اہتمام کرتے جو عام طور پر ہر امت کے علماء کا فریضہ رہا ہے اور اس صورت میں قرآن کریم کا یہ ارشاد لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا ۔یعنی ہم نے تم میں سے ہر امت کے لئے ایک خاص شریعت اور خاص راستہ بنایا ہے یہ سب بے معنی ہوجاتا ہے اور پھر اس کا کیا جواز رہ جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے اوپر اور اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود ونصاریٰ سے اور دوسری قوموں سے نہ صرف تبلیغی جہاد کیا بلکہ قتل وقتال اور سیف وسنان کی جنگیں بھی لڑیں اور اگر انسان کے مؤمن اور مقبول عنداللہ ہونے کے لئے صرف اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہو تو بے چارہ ابلیس کس جرم میں مردود ہوتا کیا اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا یا وہ روز آخرت اور قیامت کا منکر تھا اس نے تو عین حالت غضب میں بھی الیٰ یوم یبعثون کہہ کر ایمان بالآخرت کا اقرار کیا ہے ۔قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں اگر بالفرض ایمان بالرسول کا ذکر بالکل نہ ہوتا تو دوسری آیات قرآن جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے جن میں

اس کی اشد تاکید موجود ہے وہ کافی تھی لیکن اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت میں بھی ایمان بالرسول کی طرف واضح اشارہ ہے کیونکہ اصطلاح قرآن میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ساری چیزوں پر ایمان ہو قرآن کریم نے اپنی اس اصطلاح کو ان الفاظ میں واضح فرمادیا: فان آمنوا بمثل آمنتم به فقداهتدوا ۔یعنی جس طرح کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا صرف وہی ایمان باللہ کہلانے کا مستحق ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے ایمان کا بہت بڑا رکن ایمان بالرسول تھا اس لئے من آمن بالله کے لفظوں میں خود ایمان بالرسول داخل ہے۔(معارف القرآن ص از ۲۰۰ تا ۲۰۳ ج ۳)

مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری انوار الباری ص ۱۰۲ ج ۲ پر لکھتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہ کے سامنے صابی کی بحث کئی جگہ آئی مگر انہوں نے کسی جگہ تشفی بخش بات نہیں لکھی ایک جگہ لکھا کہ قوم نمرود صابی تھی ان میں فلسفہ تھا اور انہی سے فارابی نے فلسفہ سیکھا ہے۔ پھر آیت: ان الذین آمنوا والذین هادوا والنصاریٰ والصابئين من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحاً فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون (آیت نمبر ۶۲ بقرہ) پر گزرے اور کیونکہ صابئین کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی اس لئے اس کی تفسیر میں صابئین کو مؤمن قرار دیا وہ سمجھے ہیں کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی یہودیت و نصرانیت کے باوجود اپنے زمانہ میں مؤمن تھے ایسے ہی صابئین بھی باوجود اپنی صابئیت کے اپنے زمانہ میں مؤمن تھے حالانکہ صابئین کسی وقت بھی ایمان نہیں لائے کیونکہ ان میں کے ایک فرقہ کا عقیدہ تو فلاسفہ کے طریقہ پر اول مبادی پر تھا دوسرا فرقہ نجوم کی پرستش کرتا تھا تیسرا فرقہ بت تراش کر ان کی عبادت کرتا تھا۔(کمافی روح المعانی واحکام القرآن للجصاص)

مولانا بجنوری اسی جگہ حاشیہ میں رقم طراز ہیں: صاحب ترجمان القرآن کے میلان وحدت ادیان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے آیت مذکورہ کے ترجمہ و نوٹ مندرجہ صفحہ ۲۳۷ میں بھی انہوں نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ صابئین کو ملت حقہ مان کر لکھا کہ:

''ان میں سے کوئی ہو اور کسی گروہ بندی میں سے ہو، لیکن جو کوئی بھی خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان وعمل صالح کا اجرا اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی''۔

ممکن ہے مولانا کو صابئین کے بارہ میں یہ مغالطہ حافظ ابن تیمیہ کی وجہ سے ہوا ہو کیونکہ وہ ان کے غالی معتقد تھے ہم لوگ بھی حافظ ابن تیمیہ کے علم وفضل اور جلالت قدر کے بڑے معترف ہیں مگر ان کے تفردات پر نہیں جاتے اور ''الحق احق'' پر عمل کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے فوائد میں تحریر فرمایا:

''صابئین ایک فرقہ ہے جس نے ہر ایک دین میں سے اچھا سمجھ کر کچھ اختیار کر لیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں اور فرشتوں کی بھی پرستش کرتے ہیں اور زبور پڑھتے ہیں اور کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، غرض آیات میں صابئین کا ذکر بطور ملت حقہ کے نہیں ہوا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ یہود ونصاریٰ کی طرح اگر وہ بھی اپنے اصل دین کی صداقت پر قائم ہو جائیں تو ناجی ہوں گے اگرچہ خود یہ اصول بھی صحیح نہیں کیونکہ اسلام نے تمام ادیان سماویہ سابقہ حقہ وغیر حقہ کو منسوخ کر دیا ہے۔ نہ کسی سابق دین کی اصل صورت وحقیقت اب باقی رہی ہے۔(ص۱۰۲ ج۲)

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ علماء نے من آمن بالله میں مراد من یؤمن لیا ہے یعنی ان میں سے جو مستقبل میں اس طرح ایمان لائے گا، الخ۔ تاکہ بظاہر آمنوا سابق سے تکرار لازم نہ آئے۔

میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ دوسرے جملہ من آمن باللّٰہ کو بطور استیناف مانا جائے جس طرح نحو میں لفظ ''اما'' کے ذریعہ استیناف ہوا کرتا ہے۔(مثلا اما علمافکذا

واما عملاً فکذا وغیرہ)فرمایا کہ صابی کے معنی ہیں ہٹا ہوا، اور پھرا ہوا راہ سے (اس کا مقابل حنیف ہے سیدھا ایک جانب دین حق کی طرف چلنے والا کہ دوسرے جوانب واطراف کی طرف رخ نہ پھیرے)۔

حافظ ابن تیمیہ کی چونکہ عربیت ناقص ہے اس لئے انہوں نے صابی کے معنی وحقیقت کو صحیح طور سے نہیں سمجھا اور غلطی سے اس کو دین سماوی کا ایک فرقہ اور مومن قرار دیا ہے۔(انوار الباری ص ۱۰۸ ج ۲)

مولانا بجنوری حاشیہ میں ارقام فرماتے ہیں:

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ صاحب ''ترجمان القرآن'' کی بھی چونکہ عربیت قاصر ہے اس لئے فھم فیہ سواء کا ترجمہ ''حالانکہ وہ برابر ہیں'' کیا جبکہ عربی زبان میں ''فا'' حالیہ نہیں ہوتی اسی طرح یوم یکشف عن ساق کی تفسیر کرتے ہوئے کشف ساق سے مراد کفار ومشرکین مکہ کی سیاسی ذلت ونا کامی فتح مکہ کے موقع کی لی ہے۔اور کشف ساق کا محاورہ جنگ کی شدت سے لیا ہے حالانکہ اس آیت میں نہ کشف حرب عن الساق والے محاورے سے کچھ تعلق ہے نہ کسی مفسر نے اس طرح تفسیر کی اور کبار محدثین نے بھی اس کو قیامت کے دن کا حال بتلایا ہے نہ کہ فتح مکہ کا اسی طرح آیت فقبضت قبضۃ من اثر الرسول، الخ۔ کا ترجمہ کہ:

''میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی اس لئے (اللہ کے) رسول کی پیروی میں میں نے بھی کچھ حصہ لیا تھا پھر چھوڑ دیا''۔

اور تشریح اس طرح کی:

''جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا تو دین حق سے کیوں پھر گیا؟ تو اس نے کہا میں نے اللہ کے رسول کی (یعنی آپ کی) ایک حد تک پیروی کی کیونکہ جو بات میری قوم کے دوسرے آدمی نہ پا سکے تھے میں نے پالی تھی مگر پھر میں نے آپ کا

طریقہ چھوڑ دیا''۔(ترجمان القرآن ص ۴۵۶ ج ۱۲ استقلال پریس لاہور)

اس میں ایک تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحالت خطاب غائب قرار دیا ہے، دوسرے فقبضت قبضة کا ترجمہ رسول کی پیروی میں کچھ حصہ لیا تھا نہ عربی زبان کے محاورہ کے لحاظ سے صحیح ہے نہ کسی مفسر نے ایسی تفسیر کی ہے۔تفسیر ابن کثیر وروح المعانی وغیرہ میں پورا واقعہ مستند طریقہ سے بتفصیل نقل ہوا ہے وہاں دیکھا جائے واللہ اعلم۔

(حاشیہ انوار الباری ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ج ۲)

آیت کریمہ فقبضت قبضة من اثر الرسول کی صحیح تفسیر جو صحابہ کرام اور تابعین عظام نیز جلیل القدر ائمہ تفسیر سے منقول ہے اس کا تذکرہ عن قریب زیر عنوان''سامری کا واقعہ'' آرہا ہے۔

''رفع طور'' اور ''نتق جبل'' کا واقعہ

مولانا بجنوری لکھتے ہیں:

سورۃ اعراف میں ''نتق جبل'' کا لفظ ہے یعنی جڑ سے اکھڑ کر ہٹ جانا اور سورۃ بقرہ میں ''رفع الطّور'' کا لفظ ہے یعنی اپنی جگہ سے اٹھانا مگر اس مطلب کو خلاف عقل خیال کر کے بعض لوگوں نے بدل دیا ہے۔(انوار الباری ص ۱۵۶ ج ۷)

حاشیہ میں مولانا نے لکھا ہے ''ترجمان القرآن'' ص ۴۳ ج ۲ میں ہے:

''اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو زلزلہ میں ڈالا تھا گویا ایک سائبان ہے (جو ہل رہا ہے) اور (وہ دہشت کی شدت میں) سمجھتے تھے کہ بس ان کے سروں پر آگرا''۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے لکھا کہ: یہ نقل کردہ معنی صاف بول رہے ہیں کہ وہ منطوق قرآنی کے خلاف کھینچ تان کر بنائے گئے ہیں۔ (قصص القرآن ص ۴۷۷ ج ۱/ انوار الباری ص ۱۵۶ ج ۷)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس واقعہ کی تحقیق کرتے ہوئے جمہور سلف صالحین کی موافقت میں سورۃ اعراف کی آیت واذ نتقنا الجبل فوقھم، الآیۃ۔ وغیرہ کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ:

''ان آیات میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے جب تورات کو قبول کرنے میں پس وپیش کیا بلکہ انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں پر طور کو بلند کر دیا اور اس طرح آیۃ اللہ کا مظاہرہ کر کے ان کو قبول تورات پر آمادہ کیا پس کوئی وجہ نہیں کہ آیات کے ظاہر کو تاویلات میں گھسیٹا جائے جیسا کہ بعض معاصر مفسرین نے کیا ہے''۔

کسی پہاڑ کا جڑ سے اکھڑ کر فضا میں معلق ہو جانا نہ عقلاً محال ہے اور نہ قانون قدرت کے منافی البتہ انوکھا اور حیرت زدہ واقعہ ضرور ہے اور اس لئے'' آیت اللہ'' کہلانے کا مستحق۔ مگر تاویل کرنے والے کہتے ہیں کہ'' رفع'' کے معنی صرف بلندی کے آتے ہیں نہ کہ سر پر بلند ہونے اور'' خوفناک حرکت کرنے'' کے بھی آتے ہیں۔

اس کے بعد'' ترجمان القرآن'' سے وہ تاویلی معنیٰ جو منطوق قرآنی کے خلاف کھینچ تان کر بنائے گئے ہیں اور جن کا ذکر'' انوارالباری'' کے حوالہ سے اوپر آیا ہے اس کی تردید کرتے ہوئے متعدد معانی میں سے کسی معنیٰ کی تعیین کے لئے ایک ضروری تفسیری قاعدہ کی صرف رہنمائی کی ہے لکھا ہے کہ:

'' مگر ان حضرات نے اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا کہ'' رفع'' اور'' نتق'' کے اگر متعدد معانی آتے ہیں تو عربیت کے قاعدہ سے اس مقام پر جو قرینہ پایا جاتا ہو اس کے مطابق معنی متعین ہوں گے خصوصاً جبکہ قرآن عزیز کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے تو بے شبہ کسی لفظ کے مشہور معانی میں سے صرف وہی معنیٰ مراد ہوں گے جو دوسری آیت کے ذریعہ متعین ہوتے ہیں۔ پس بقرۃ کی آیت'' ورفعنافوقکم الطور '' میں'' رفع'' اور'' فوق'' کو جب اعراف کی آیت'' نتقناالجبل '' میں'' نتق'' کے ساتھ ملائیں گے تو قرآن

عزیز کی ان آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہی بنے گا کہ طور کو اس کی جگہ سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے سروں پر اس طرح کر دیا گیا گویا ایک سائبان ہے جو عنقریب ان پر گرنے والا ہے۔ نیز ''فوق'' کا ''رفع'' کے ساتھ لانا بھی اس تفسیر کی صحت کے لئے موثق شہادت ہے جو جمہور نے بیان فرمائی ہے''۔ (قصص القرآن ص ۲۷۶ ج ۱)

مولانا آزاد نے ورفعنافوقکم الطور کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

''اور (یہ وہ وقت تھا کہ تم نیچے کھڑے تھے اور) کوہ طور کی چوٹیاں تم پر بلند کر دی تھیں''۔ (ص ۲۳۷ ج ۱)

واقعہ قتل وذبح بقرہ

مولانا بجنوری لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ بنی اسرائیل میں کوئی قتل ہو گیا اور قاتل کا پتہ چلنا دشوار ہوا، باہمی کشت وخون کی نوبت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف رجوع کیا گیا، آپ نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا، ارشاد ہوا کہ یہ لوگ ایک گائے ذبح کریں پھر گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے جسم سے مس کریں ایسا کریں گے تو مقتول زندہ ہو کر خود ہی اپنے قاتل کے نام بتلا دے گا بہت کچھ ردوکد کے بعد وہ ذبح بقرہ پر آمادہ ہوئے اور خدا کے حکم سے مقتول نے زندہ ہو کر سارا واقعہ بتلا دیا اس طرح پوری قوم خانہ جنگی سے بچ گئی اس واقعہ میں علاوہ حق تعالیٰ کی عظیم قدرت وعظمت کے اظہار کے انہی لوگوں کے ہاتھوں سے بقرہ کو ذبح کرانا بھی مقصود تھا جو ایک مدت تک اسی کی پرستش کر چکے تھے۔ (انوار الباری ص ۱۵۷ ج ۷)

اسی صفحہ کے حاشیہ میں مولانا نے لکھا ہے ''ترجمان القرآن'' ص ۲۶۹ ج ۱ میں ہے:

'' ہم نے حکم دیا اس (شخص) پر (جو فی الحقیقت قاتل تھا) مقتول کے بعض (اجزائے جسم) سے ضرب لگاؤ (جب ایسا کیا گیا تو حقیقت کھل گئی اور قاتل کی شخصیت معلوم ہو گئی)''۔

گویا بقرہ اور ذبح بقرہ سے اس واقعہ قتل کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس واقعہ میں احیاء موتیٰ کی کوئی نشانی دکھلائی گئی ہے۔(انوار الباری ص ۱۵۸ ج ۷)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس واقعہ کے بارہ میں تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے فرمایا کہ ان سے کہو کہ پہلے ایک گائے ذبح کریں اور اس کے بعد گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے جسم سے مس کریں پس اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم اس کو زندگی بخش دیں گے اور یہ معاملہ واضح ہو جائے گا''۔ (قصص القرآن ص ۴۸۲ ج ۱)

پھر لکھتے ہیں:

اس واقعہ کے متصل ہی ارشاد ہے''كذلك يحي الله الموتىٰ ''اور اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کردے گا اور اسی کے سیاق میں ارشاد فرمایا''ويريكم آيته ''تاکہ دکھلائے تم کو اپنی قدرت کے نشان۔

گویا ذبح بقرہ کا واقعہ نقل کرنے سے قبل بنی اسرائیل کو بار بار خدائی نشان مشاہدہ کرانے کا ذکر اور پھر قصہ کے متصل ہی آخرت میں''احیاء موتیٰ کا اس واقعہ سے استشہاد اور پھر اس واقعہ کو بھی''آیات اللہ''میں سے ایک آیت (نشان) بنانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کسی تاویل اور دور از کار باتوں کی پناہ لئے بغیر ان آیات کی صاف اور سادہ تفسیر وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کی گئی لہٰذا ان آیات کی وہ تفاسیر''جو جدید معاصرین نے بیان کی ہیں اور جن میں تمام آیات متعلقہ کو کبھی دو جدا واقعات کہہ کر اور کبھی ایک واقعہ تسلیم کر کے مختلف رکیک اور لچر تاویلات سے کام لیا گیا ہے''نا قابل تسلیم ہیں اور قرآن عزیز کے منطوق کے خلاف۔(قصص القرآن ص ۴۸۸ ج ۱)

سامری کا واقعہ

قال بصرت بما لم يبصروا به فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها

و کذٰلك سولت لی نفسی ۔موسیٰ علیہ السلام نے کہا پس اے سامری! تیرا کیا معاملہ ہے؟ سامری نے کہا: میں نے اس چیز کو دیکھا جس چیز کو انہوں نے نہیں دیکھا پس میں نے رسول کے نشان سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو ڈال دیا اور میرے جی نے یہی سمجھا۔

اس واقعہ مختصر طور پر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے اس طرح بیان فرمایا:

''جس وقت بنی اسرائیل پھٹے دریا میں پیٹھے (گھسے) پیچھے فرعون ساتھ فوج کے پیٹھا (داخل ہوا) جبریل بیچ میں ہو گئے کہ ان کو ان تک نہ پہنچنے دیں، سامری نے پہچانا کہ یہ جرنیل ہیں ان کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اٹھالی، وہی اب اس سونے کے بچھڑے میں ڈال دی، سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا فریب سے، اس میں مٹی پڑی برکت کی حق و باطل مل کر ایک ''کرشمہ'' پیدا ہوا کہ رونق جاندار کی اور آواز اس میں ہو گئی ایسی چیزوں سے بچنا چاہیے اسی سے بت پرستی بڑھتی ہے''۔

اس تفسیر کے متعلق صاحب روح المعانی ارشاد فرماتے ہیں: آیت کی یہ تفسیر وہ ہے جو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور جلیل القدر مفسرین سے منقول ہے۔ (روح المعانی ص ۲۲۹ ج ۱۶)

اس تفسیر کے خلاف دوسری تفسیر مشہور معتزلی ابومسلم اصفہانی کی ہے، وہ جس کو امام رازی رحمہ اللہ نے ''تفسیر کبیر'' میں تحقیق سے قریب تر کہا ہے اور علماء عصر میں سے مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ''ترجمان القرآن'' میں اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا کہ مجھ کو بنی اسرائیل کے خلاف یہ بات سوجھی کہ آپ حق پر نہیں ہیں اور ساتھ ہی میں نے آپ کا کچھ اتباع کیا تھا اور پیروی اختیار کر لی تھی مگر میرا دل اس پر نہ جما اور آخر کار میں نے اس اتباع اور پیروی کو بھی ترک کر دیا اور اسی طریق کار کو میرے نفس نے بہتر جانا گویا ابومسلم

کے نزدیک آیت ''فبصرت بمالم یبصروابه'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ سامری بنی اسرائیل کے عقیدے کے خلاف حضرت موسیٰ کو حق پر سمجھتا تھا۔ اور ''قبضت قبضة من اثر الرسول'' ''میں ''رسول'' سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ''اثر الرسول'' سے مراد پیروی اور اتباع ہے اور ''قبضہ'' سے تھوڑی سے پیروی مراد، اور اس لئے آیت میں فنبذتها سے ترک اتباع مراد ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا تبصرہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مشہور محدث ومفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر اور ان کے معاصر مشہور مفسر ابن حبان اندلسی کی تفسیر ''البحر المحیط'' سے ان کی آراء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان جلیل القدر مفسرین کے اس طرز تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اگر چہ جمہور کی تفسیر ہی کو صحیح یا راجح سمجھتے ہیں مگر دوسرے احتمال کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ نصوص قطعیہ کے خلاف ہے اور ایسا احتمال ہے جس کی پشت پر الحاد وزندقہ کی کارفرمائی ہے البتہ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس آیت کا سیاق وسباق اور قبول حق اور ترک حق کے متعلق مختلف مقامات میں قرآن کا اسلوب بیان دونوں امور ابومسلم کی تفسیر کا قطعاً انکار کرتے اور اس کو تاویل محض ظاہر کرتے ہیں اس لئے آیت زیر بحث کے جملہ بصرت بمالم یبصروابه میں بصارت سے بصارت عینی کی جگہ بصیرت قلبی مراد لینا اور حضرت موسیٰ سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی ''الرسول'' کہہ کر ان کو غائب کے قائم مقام بنانا''قبضت قبضة'' کے معنیٰ مٹھی بھر لینا کی جگہ ''تھوڑا سا اتباع کر لینا'' بیان کرنا اور جملہ ''نبذتها'' سے ترک اتباع مراد لینا یہ سب علیحدہ علیحدہ جملہ کے اعتبار سے اگر چہ محاورات عرب میں قابل تسلیم ہیں لیکن پورے نظم کلام کے پیش نظر لچر تاویل سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ اور سیاق وسباق شہادت دے رہا ہے کہ اس جگہ وہی معنیٰ راجح ہیں جو جمہور کا مختار ہیں کیا یہاں یہ

اصولی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اگر سامری کو صرف یہ بتانا تھا کہ میں دل سے آپ کا معتقد نہیں تھا مگر مصلحتاً کچھ دنوں کے لئے آپ کی پیروی کر رہا تھا اور اب اس کو بھی ترک کر دیا تو اس صاف اور سادہ بات کے لئے قرآن عزیز کو ایسے ذو معنیٰ اور مبہم اظہار بیان کی کس لئے ضرورت پیش آئی کہ بقول آزاد صاحب:

''مفسرین کو یہ موقع مل گیا کہ انہوں نے یہودیوں میں مشہور روایت کو ٹھیک آیت زیر بحث پر چسپاں کر دیا''۔

درحقیقت آیت کا سیاق وسباق صاف ظاہر کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے سوال پر سامری کا جواب ضرور کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو محیر العقول بھی تھا اور اس کو کج فطرت انسانوں کی گمراہی کے لئے آلۂ کار بھی بنایا جا سکتا تھا''۔(قصص القرآن ص ۴۶۴ ج ۱)

''بہرحال جمہور کی تفسیر ہی صحیح اور قرآن عزیز کے اسلوب بیان کے مطابق ہے''۔(قصص القرآن ص ۴۶۵ ج ۱)

واقعہ ملاقات حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام

مولانا احمد رضا صاحب بجنوری لکھتے ہیں کہ:

مولانا آزاد نے نہ معلوم کن وجوہ سے حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ کی تفصیلات وتحقیق مقامات وغیرھا سے بالکلیہ کنارہ کشی اختیار کی بلکہ صرف اتنا لکھا کہ:

''اس بارہ میں بہت سی روایتیں مفسرین نے نقل کر دی ہیں جن کی صحت محل نظر ہے اور تصریحات متناقض اور زیادہ تر اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں''۔(ترجمان ص ۲۹۹ ج ۲)

تبصرہ

مولانا آزاد نے اسی مقام پر اصحاب کہف کے بارہ میں اچھی تفصیل سے نوٹ لکھے اور پھر ذوالقرنین کے سلسلہ میں بھی خوب خوب داد تحقیق دی لیکن درمیانی واقعہ ملاقات حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کی تشریح وتحقیق کو نظر انداز کر دیا آپ نے دیکھا کہ

تمام کبار محدثین ومفسرین نے اس واقعہ کی تفصیل وتحقیق کے لئے کتنی کاوش کی ہے اوراس واقعہ کی علم وعمل کے لحاظ سے بھی کس قدر اہمیت ہے اس بارہ میں جوروایات اصحاب ستہ، حافظ ابن حجر، حافظ عینی، حافظ ابن کثیر، صاحب روح المعانی وغیرہم نے ذکر کی ہیں کیاوہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں؟ کیسی مغالطہ آمیز بات کہی گئی ہے اوہ پھروہ بھی ایسے محل میں کہ جہاں حضرت ابن عباس اور حربن قیس کا نزاع ہی صرف اس لئے ہوا کہ تورات میں اس واقعہ کی تفصیلات نہیں تھیں اور حربن قیس کی غلط فہمی کا ازالہ بھی احادیث صحیحہ کی روشنی میں کیا گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ میں بہت سی باتیں بطور خرق عادت پیش آئی ہیں اور ایسے مواقع میں مولانا آزاد جبھی کچھ کہتے ہیں کہ وہ اپنے نزدیک ان کی کوئی معقول یا منقول توجیہ نکال سکیں اور یہاں ایسا نہ ہوسکا ہوگا یا مستشرقین کی اس بارہ میں تحقیق عالیہ نہ ملی ہوں گی اس لئے تحقیق کلام کا موقع نہ پایا واللہ اعلم بمراد عبادہ۔ (انوار الباری ۱۰۲ ج ۳)

واقعہ ذوالقرنین

اس واقعہ کی تحقیق میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کچھ لکھا ہے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کو نہ صرف قابل توجہ بلکہ دلائل وبراہین کی قوت کے لحاظ سے اس کو بلاشبہ صحیح اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف اور تاریخی حقائق کی مطابقت کے پیش نظر ہر طرح لائق ترجیح قرار دیا ہے اس کے ساتھ ہی حاشیہ (ص ۱۵۶ ج ۳) میں لکھا ہے:

اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصۂ بیان سے سخت اختلاف ہے جوانہوں نے علماء سلف کے خلاف یاجوج وماجوج کے آخری خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے اس لئے کہ یہ حصہ تحقیق بلاشبہ باطل ہے۔

پھر ص ۲۲۷ ج ۳ پر اس کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ترجمان القرآن'' میں اور بعض دوسرے علماء نے کتب سیرت میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ سورۃ انبیاء کی ان آیات کا مصداق جن

میں یاجوج وماجوج کے موعود خروج کا ذکر کیا گیا ہے حتٰی اذافتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون ۔فتنۂ تاتار کو بنا کر یہیں ختم کردیں اوراس کا امارت ساعت وعلامت قیامت سے کوئی تعلق نہ رہنے دیں مگر ہمارے نزدیک قرآن عزیز کا سیاق وسباق ان کی اس تفسیر یا توجیہ کا قطعاً اباء اورانکار کرتا ہے۔اور یہ اس لئے کہ سورۃ انبیاء میں اس واقعہ کو جس ترتیب سے بیان کیا ہے وہ یہ ہے وحرام علٰی قریة اھلکنھاانھم لایرجعون حتٰی اذافتحت ،الآیة ۔اور مقرر ہو چکا ہے ہر ایک ایسی بستی پر کہ جس کو ہم نے ہلاک کردیا ہے کہ اس کے بسنے والے واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ کھول دیئے جائیں یاجوج وماجوج اوروہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے امنڈ پڑیں الخ۔

ان آیات میں آیت زیر بحث حتٰی اذافتحت ،الآیة۔ سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ مرنے والوں کی موت کے بعداب ان کے لئے اس دنیا میں دوبارہ زندگی نہیں ہے اورآیت زیر بحث میں یہ کہا گیا ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا وقت جن علامات وآیات کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے یا جن پر معلق کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یاجوج وماجوج کے تمام قبائل اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیک وقت اپنے مرکز سے نکل کر تیزی سے تمام دنیا پر چھا جائیں اوراس سے متصل آیت میں مزید یہ کہا گیا کہ پھراس کے بعد قیامت بپا ہوجائے گی اور تمام شخص اپنی زندگی کے نیک وبدانجام دیکھنے کے لئے میدان حشر میں جمع ہوجائیں گے اورنا کام اپنی ناکامی پر حسرت ویاس کرتے رہ جائیں گے،پس آیت زیر بحث کے سیاق وسباق نے یہ بات بخوبی واضح کردی کہ اس مقام پر یاجوج وماجوج کے ایک ایسے خروج کی اطلاع دی گئی ہے جس کے بعد شرور وفتن کا کوئی سلسلہ بلکہ دنیا کی ہستی کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہ جائے گا اورصرف قیامت بپا ہوجانے یعنی نفخ صور کی دیر باقی رہ جائے گی جواس واقعہ کی تکمیل کے بعد عمل میں آجائے گی لہٰذا آیت کے سیاق وسباق سے قطع نظر کرتے ہوئے اورحدیث ویل للعرب من شرقداقترب کا مصداق

''فتنۂ تاتار'' کو متعین کرتے ہوئے سورۃ انبیاء کی اس آیت کو آخری علامت ساعت سے نکال کر فتنۂ تاتار پر محمول کر لینا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا نیز جمہور سلف صالحین کی مسلمہ توجیہ کے قطعاً خلاف ہے۔ (قصص القرآن ص ۲۳۹ ج ۳)

پھر ایک اعتراض کا جواب دینے کے بعد لکھا ہے کہ:

''الحاصل جن معاصر مفسرین نے سورۃ انبیاء کی زیر بحث آیات کا مصداق فتنۂ تاتار کو بتایا ہے اور اس کی تائید میں بخاری کی مشہور حدیث ویل للعرب من شرقداقترب کو پیش کیا ہے ان کی یہ تفسیر غلط ہے اور حدیث سے اس کی تائید قطعاً بے محل ہے بلکہ بخاری ومسلم کی دوسری صحیح احادیث جو کتاب الفتن میں مذکور ہیں اس تفسیر کے خلاف صاف صاف یہ بیان کرتی ہیں کہ علامات قیامت میں جب آخری علامات رونما ہوں گی تو پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہوگا پھر دجال کا سخت فتنہ برپا ہوگا اور آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں وہ مارا جائے گا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد یاجوج ماجوج کا موعود خروج ہوگا جو تمام دنیا پر شر وفساد کی صورت میں چھا جائے گا اور پھر کچھ وقفہ کے بعد نفخ صور ہوگا اور یہ کارخانۂ دنیا درہم برہم ہو جائے گا''۔ (بخاری کتاب الفتن ج ۲ رقصص القرآن ص ۲۴۰ ج ۳)

الحاصل احادیث صحیح اور آیات قرآنی کی مطابقت کے ساتھ ساتھ جب مسئلہ زیر بحث پر غور وفکر کیا جاتا ہے تو بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول از آسمان ضروری ہے نہ یہ کہ پہلے یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا اور پھر مسیح علیہ السلام کی آمد کا انتظار کیا جائے چنانچہ صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں مذکور ہے''۔

(مسلم کتاب الفتن رقصص القرآن ص ۲۴۲ ج ۳)

واقعہ اصحاب الکہف والرقیم

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں: فضربنا علٰی آذنهم فی الکهف سنین

عدداً۔مولانا آزاد نے فضربنا علیٰ آذانهم کے معنیٰ یہ بیان فرمائے ہیں:

''صاف معنیٰ تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہوگئے تھے یعنی دنیا کی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی''۔(ترجمان القرآن ص ۳۹۵ ج ۲)

آیت کی تفسیر میں یہ قول ضعیف اور شاذ ہے۔(فتح الباری ج ۶)

اس کے برعکس مفسرین کے نزدیک مشہور تفسیر یہ ہے کہ ان پر نیند طاری ہوگئی تھی چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا اس لئے اس حالت کو''ضرب علی الآذان'' سے تعبیر کیا گیا۔مگر اس تفسیر کے متعلق مولانا آزاد یہ فرماتے ہیں:

''اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لئے''ضرب علی الآذان'' کی تعبیر نہیں ملتی لیکن وہ (مفسرین) کہتے ہیں یہ ایک طرح کا استعارہ ہے گہری نیند کی حالت کو''ضرب علی الآذان'' کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے''۔(ترجمان القرآن ص ۳۹۵ ج ۲)

ہمارے نزدیک مفسرین کی تفسیر ہی راجح ہے اور یہ استعارہ ہر زبان کے محاورات میں پایا جاتا ہے مثلاً جب ماں گود کے بچہ کو لوریاں دے کر سلاتی ہے تو اس کے کان اور بازو پر ہاتھ رکھ کر تھپکتی جاتی ہے اس لئے اردو زبان میں بھی'' گالوں کو تھپک دینا'' نیند طاری کردینے کے لئے بولا جاتا ہے چنانچہ شیخ الہند (نوراللہ مرقدہ) نے اس جملہ کا ترجمہ اسی طرح کیا ہے''پھر تھپک دیئے ہم نے ان کے کان اس کھوہ (غار) میں چند برس گنتی کے''۔ (ترجمہ حضرت مولانا محمود حسن نوراللہ مرقدہ)

علاوہ ازیں عربی زبان میں''ضرب علی آذانه'' کے معنیٰ منعه ان یسمع کے آتے ہیں یعنی اس کو سننے سے روک دیا اب سننے سے روک دینے کی متعدد صورتیں ہیں ایک یہ کہ کوئی شخص بستی سے دور جنگل میں غار کی کھوہ میں جا بیٹھا اور اس لئے دنیا کی باتوں سے اس کے کان نا آشنا ہوگئے دوسری یہ کہ وہ بہرہ ہوگیا اور سننے سے معذور کردیا گیا تیسری

یہ کہ وہ سو گیا اور اس کے دیگر حواس ظاہرہ کی طرح کان بھی سننے سے معطل ہو گئے، لہٰذا ''ضرب علی الآذان'' کی تعبیر ان سب صورتوں کے لئے یکساں قابل استعمال ہے اور استعارہ وتشبیہ ہے تو تینوں معنی کے لئے ہے۔ البتہ مولانا آزاد کی تفسیر میں یہ اشکال ضرور لازم آتا ہے کہ اگر ''ضرب علی الآذان'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے ''یعنی وہ بحالت بیداری عام زندگی کے مطابق بستی سے دور پہاڑ کے غار میں راہبانہ زندگی بسر کر رہے تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنیٰ ہوں گے؟'' وکذٰلك بعثناهم ليتسألوا بينهم قال قائل منهم كم لبثتم قالوالبثنايوما اوبعض يوم ''اور ہم نے ان کو اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال کریں ایک نے ان میں سے کہا تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ'' کیا یہ آیت اپنے صاف معنی میں یہ ظاہر نہیں کرتی کہ ''ضرب علی الاذان'' کی صاف تعبیر یہاں وہی ہے جو جمہور مفسرین کے نزدیک صحیح اور راجح ہے بلکہ ایسے موقع پر ''بعثناھم'' کی تعبیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ مفسرین کی تفسیر کے علاوہ دوسرے معنیٰ لینا قطعاً بے محل ہیں اس جگہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے اصحاب کہف کی اس گفتگو کے بعد جو وہاں سوئے رہنے کی مدت سے متعلق ہے ان کی یہ گفتگو بھی نقل کی ہے کہ ان میں سے کوئی شہر جائے اور پوشیدہ طور پر جائے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے یہ بھی جمہور کی تفسیر کو قوت پہنچاتی ہے اس لئے کہ غار میں مدت قیام پر بات چیت اور پھر فوراً کھانے کی خواہش کا اظہار دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑیے تو صاف معنی وہی بنتے ہیں جو مفسرین نے بیان کئے ہیں اور مولانا آزاد کی یہ تفسیر کہ:

''عرصہ دراز کے بعد ان کو شہر کی حالت معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی''۔

تکلف بارد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کو شروع سے آخر تک اس واقعہ کی تمام

آیات میں تکلف بارد اختیار کرنا پڑا ہے ۔مثلاً جب قرآن نے ان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ کہا ''وتحسبهم ایقاظاً وهم رقود ۔تو ان کو گمان کرے گا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ خواب میں ہیں''تو مولانا موصوف کو اپنی تفسیر کو صحیح بنانے کے لئے''یقظه ''کے معنیٰ زندہ اور''رقد''کے معنیٰ''مردہ''کے اختیار کرنے پڑے ہیں حالانکہ ان کے حقیقی معنیٰ''بیداری'' اور''نیند''کے ہیں اور یہ معنیٰ بلا تکلف یہاں صادق آتے ہیں پس مولانا پر بھی وہی بات صادق آتی ہے جو انہوں نے مفسرین کی مسلمہ تفسیر پر لازم کی ہے یعنی''ففی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ''کلام میں استعارہ کی راہ سے مجاز اختیار کیا گیا ہے بلکہ اگر غائر نظر سے دیکھیے تو''حقیقت کے صادق ہوتے ہوئے مجاز اختیار کرنا''مولانا آزاد کی تفسیر پر تو صادق آتا ہے لیکن جمہور مفسرین کی تفسیر پر صادق نہیں آتا مولانا آزاد نے آیات زیر بحث کی تفسیر میں اگرچہ مفسرین کے مختار قول کے خلاف ضعیف قول کو اپنا مختار بنایا ہے تاہم مفسرین کے اقوال کو احتمال کے درجہ میں تسلیم کرتے ہوئے ان کی تائید میں فرماتے ہیں:

''بہرحال اگر یہاں''ضرب علی الآذان''سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ثم بعثناهم کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی وہ زندہ رہے طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربہ میں آتی رہتی ہیں پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں''(ترجمان القرآن ص۳۹۵ ج۲ ر قصص القرآن ص۲۷۲ ج۳)

وتری الشمس اذا طلعت تزاور عن کهفهم ذات الیمین (الٰی)وملئت منهم رعبا۔ان آیات میں قرآن عزیز نے اصحاب کہف کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جبکہ وہ شروع میں غار کے اندر جا کر پوشیدہ ہوئے تھے اور یہ اس لئے کہ ان آیات کے متصل ہی جو

آیات اس واقعہ پر روشنی ڈال رہی ہیں ان میں یہ باتیں مذکور ہیں وہ نیند سے بیدار ہوئے اور انہوں نے ایک رفیق کو کھانا لانے کے لئے شہر بھیجا اس کی وجہ سے شہر والوں پر حقیقت حال ظاہر ہوگئی۔

جملہ معترضہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اس حقیقت حال کے منکشف کر دینے کی مصلحت بیان کی وہ دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہوگئے اور اہل شہر نے اس غار کے دھانے پر ہیکل تعمیر کر دیا ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اس کیفیت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اصحاب کہف پر نیند طاری ہونے کی حالت میں گزری یعنی اس غار کی اندر سے کیا حالت تھی ، دھوپ اور تازہ ہوا پہنچنے نہ پہنچے کی کیا کیفیت تھی ، ایک طویل مدت تک خواب کی حالت میں رہنے کی کیا شکل تھی ، کیا ایک ہی کروٹ پر سوئے رہے یا زندہ انسانوں کی طرح کروٹیں بدلتے رہے تھے، ان کا کتا کس طرح وفاداری کا حق ادا کر رہا تھا، اس مجموعی کیفیت کا اثر باہر سے جھانک کر دیکھنے والے انسان پر کیسا پڑتا تھا۔ جمہور مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے اور آیات کے باہم نظم و ترتیب کے لحاظ سے یہ بہت صاف اور واضح تفسیر ہے مگر مولانا آزاد ان تمام آیات کو اصحاب کہف کے دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہو جانے کے متعلق سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن یہ تفصیلات اس حالت کی بیان کر رہا ہے جب ان پر موت طاری ہو چکی تھی اور پھر انہوں نے ایقاظ میں یقظہ کے معنیٰ زندگی اور ''رقود'' میں رقد کے معنیٰ موت کے اختیار کر کے کافی تکلف کیا ہے اور محض مقدمات کے اضافے کے ساتھ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ چونکہ مفسرین نے ان آیات کو اصحاب کہف کے پہلی مرتبہ غار میں پوشیدہ ہو جانے سے متعلق کہا ہے اس لئے ان کو آیات کی تفسیر میں حیرانی پیش آئی ہے مگر اس پوری تفسیر کے مطالعہ سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیات زیر بحث کی تفسیر میں مفسرین قدیم کو تو کوئی حیرانی پیش نہیں آئی البتہ خود مولانائے موصوف کو اپنی اختیار کردہ تفسیر کی وضاحت میں

ضرور تکلفات باردہ اختیار کرنے پڑے ہیں'' اور سچ پوچھئے تو اس مقام پر ان کی تفسیر تاویل ہوکر رہ گئی ہے''۔(قصص القرآن ص ۲۷۸ ج ۳)

واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''سورۂ کہف کے تفسیری فوائد سپرد قلم کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک جگہ سورۂ بقرہ کے اس واقعہ کو حضرت حزقیل علیہ السلام کا مکاشفہ قرار دیا ہے جو اس واقعہ سے قریب قریب صحیفہ حزقیل میں مذکور ہے''۔(ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۲۱)

اصل عبارت ''ترجمان القرآن'' کی یہ ہے:

''اس پیشین گوئی کا محل ٹھیک اس مکاشفہ کے بعد ہے جس میں حزقیل نبی نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں کو زندہ ہوتے دیکھا تھا اور جسے قرآن نے بھی سورۂ بقرہ کی آیت او کالذی مر علٰی قریة وهی خاوية علٰی عروشها (۲۵۹) میں کہا ہے''۔

تبصرہ

ہم کو سخت تعجب ہے اور حیرت بھی کہ جب قرآن عزیز نے اس واقعہ کو صاف اور صریح طریقہ پر ایک شخص کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک معین مدت کے لیے موت کی آغوش میں سلا دیا اور پھر زندہ کر کے اس سے موت کی مدت کے بارہ میں سوال کیا جب وہ صحیح جواب نہ دے سکے تو خود اس کی تصحیح فرمائی اور اس سے متعلق شواہد کا مشاہدہ کرایا تو کس طرح مولانا آزاد نے حزقیل کے مکاشفہ کو اس واقعہ کی تفسیر یا تاویل قرار دیا۔

غور کیجئے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا ایک ایسی کھنڈر اور ویران بستی پر گزر ہوا جو کبھی بہت ہی بارونق آباد بستی تھی اور جہاں لاکھوں انسان بس رہے تھے۔ او کالذی مر علٰی قرية وهی خاوية علٰی عروشها۔ اس نے یہ دیکھا تو دل میں سوچا یا زبان سے کہا کہ نہ

معلوم کس طرح یہ مردہ بستی پھر زندہ ہوگئی:قال انّٰی یحی ھٰذہ اللّٰہ بعدموتھا ۔تب اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ اس کی روح قبض کر لی اور سو برس تک اسی حالت میں رکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا:فاماتہ اللہ مائة عام ثم بعثہ اور زندگی بخشنے کے بعد اس ہستی سے دریافت فرمایا: بتاؤتم یہاں کتنی مدت پڑے رہے؟ برگزیدہ ہستی نے جواب دیا:ایک دن یا دن کا بعض حصہ۔قال کم لبثت قال لبثت یوماً او بعض یوم ۔چونکہ جواب غلط تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اور حقیقت حال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایانہیں بلکہ سو برس تک موت کی آغوش میں سوتے رہے ہو،قال بل لبثت مائة عام ۔اور پھر اپنی قدرت کاملہ کے تصرفات کا مشاہدہ کرایا کہ ایک جانب اس طویل مدت کے باوجود کھانے پینے کی تمام چیزیں تر و تازہ اور موسمی اثرات سے محفوظ تھیں اور دوسری جانب ان کی سواری کا گدھا گل سڑ کر بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔فانظر الٰی طعامك وشرابك لم یتسنہ اور پھر فرمایا کہ ہم نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ تم کو دوسروں کے لیے اپنی قدرت کاملہ کا ایک نشان بنا دیں۔ولنجعلہ آیة للناس ۔پھر ان تمام باتوں کے بعد اس بزرگ ہستی کو مشاہدہ کرایا کہ کس طرح ہڈیوں نے آپس میں ترتیب پائی پھر اس پر گوشت چڑھا اور پھر چمڑا اور ان کا گدھا زندہ کھڑا ہو گیا۔وانظر الٰی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحماً یہ سب کچھ دیکھ لینے اور مشاہدہ کر لینے کے بعد جب علم الیقین نے عین الیقین کا درجہ حاصل کر لیا تو فوراً اس برگزیدہ ہستی نے اعتراف کیا کہ بے شک خدا کی قدرت کاملہ کے لیے اسباب و وسائل کی حاجت نہیں وہ جس طرح چاہے بے روک ٹوک تصرف کرے کوئی اس کے لیے مانع نہیں ہے۔فلماتبین لہ قال اعلم ان اللہ علٰی کل شئ قدیر۔

اب ان صاف اور واضح آیات پر دوبارہ غور کیجیے اور سوچیے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو ایک حقیقی واقعہ کی حیثیت سے بیان کیا ہے یا مجاز کے طور پر ایک مکاشفہ کی شکل میں ۔ نیز کیا حزقیل علیہ السلام اور ان آیات میں ذکر کردہ واقعہ کے درمیان مشابہت کی وجہ

سے دونوں کو ایک بتانا کسی طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں پس بلاشبہ مولانا آزاد کی یہ تاویل ''تاویل باطل'' ہے۔ (قصص القرآن ج ۲ ص ۲۴۱،۲۴۲)

''حیات بعد الموت'' کے عنوان کے تحت میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ:

''قرآن عزیز نے حیات بعد الممات کا عام قانون تو یہ بتایا ہے کہ اس دنیوی موت کے بعد پھر عالم آخرت ہی کے لیے دوبارہ زندگی ملے گی لیکن قانون خاص یہ ہے کہ کبھی کبھی حکمت و مصلحت کے پیش نظر خدائے تعالیٰ اس دنیا ہی میں مردوں کو زندگی بخش دیا کرتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کی معجزانہ زندگی میں خود قرآنی شہادت کے مطابق اس حقیقت کا متعدد مرتبہ ظہور ہو چکا ہے .....سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بھی قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے نمائندوں کی موت و ہلاکت اور اس کے بعد ان کے ''بعث'' جی اٹھنے کا ذکر کیا ہے اور لعلکم تشکرون کہہ کر اس واقعہ کی اصلی حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ بے شبہ صورت یہ پیش آئی کہ ان کے نامعقول اور گستاخانہ اصرار پر ''رجفہ'' کے عذاب نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عاجزانہ دعا پر خدا کی وسعت رحمت نے ترس کھایا اور ان سوختہ جان انسانوں کو دوبارہ زندگی بخش دی تا کہ یہ شکرگزار رہوں اور آئندہ اس قسم کی بے جا ضد کو کام میں نہ لائیں اور خدا کے سچے فرمان بردار بن جائیں۔

اس تفصیل کے بعد یہ باآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ جن معاصر مفسرین نے آیت کی تفسیر اس حیات بعد الممات سے بچنے کے لیے رکیک تاویلات کے ساتھ کی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور انہوں نے بغیر کسی سند اور دلیل کے قرآن عزیز کے صاف اور صریح اسلوب بیان کو تفسیر بالرائے پر قربان کر دیا''۔ (قصص القرآن ۴۷۳)

واقعہ حضرت زکریا علیہ السلام

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب ''چند تفسیری حقائق'' کے تحت لکھتے ہیں:

''سورۂ آل عمران اور مریم میں ہے کہ جب زکریا علیہ السلام کو یحیٰ علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی گئی تو وہ تعجب کا اظہار کرنے لگے کہ میں ضعیف العمر اور بیوی بانجھ، پھر بشارت کس طرح عالم وجود میں آئے گی''۔

سورۂ آل عمران اور مریم میں ہے: آیتك ان لاتکلم الناس ثلٰث لیال سویا ۔ ہم نے اس کی تفسیر جمہور کے مطابق کی ہے چنانچہ عبداللہ بن عباس، مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور دوسرے علماء اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اعتقل لسانه من غیرمرض ولاعلة۔ وقال زیدبن اسلم من غیرمرض ولایستطیع ان یکلم قومه الااشارة ۔ (تفسیر ابن کثیر ج۳ص۱۱۲) ان کی زبان تین دن کے لیے بغیر کسی مرض اور خرابی کے بندھ گئی، اور زید بن اسلم کہتے ہیں ان کی زبان گنگ کے مرض سے پاک رہتے ہوئے تین دن کے لیے بند ہوگئی تھی اور ان میں یہ قدرت نہیں رہی تھی کہ قوم سے اشارہ کے سوا بول سکیں۔ (قصص القرآن ج۲ص۲۶۰)

ص۲۵۵ پر لکھا ہے:

''اب زکریا علیہ السلام نے درگاہ الٰہی میں عرض کیا، خدایا ایسا نشان عطا کر جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ بشارت نے وجود کی شکل اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''علامت یہ ہے کہ جب تم تین روز تک بات نہ کر سکو اور صرف اشاروں سے ہی اپنا مطلب ادا کر سکو تو سمجھ لینا کہ بشارت نے وجود اختیار کر لیا لیکن ان دنوں میں تم خدا کی تسبیح وتہلیل میں زیادہ مشغول رہنا''۔

لیکن مولانا آزاد ''ترجمان القرآن'' میں جمہور کی تفسیر سے جدا یہ معنیٰ بیان کرتے ہیں کہ زکریا علیہ السلام سے کہا گیا کہ: ''تم بنی اسرائیل کے روزوں کی طرح تین دن کھانے پینے وغیرہ سے باز رہنے کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی اختیار کیے رہو تو موعودہ بشارت کا وقت شروع ہو جائے گا''۔

چنانچہ لوقا کی انجیل کا حوالہ نقل کر کے آخر میں فرماتے ہیں:

"قرآن نے یہ نہیں کہا کہ حضرت زکریا گونگے ہوگئے، یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں جو حسب معمول پیدا ہوگئیں، صاف بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت زکریا کو روزہ رکھنے اور مشغول عبادت رہنے کا حکم ہوا اور یہودیوں کے یہاں روزہ کے اعمال میں ایک عمل خاموشی بھی تھی"۔

ان لاتکلم الناس کی یہ تفسیر اگرچہ عربیت کے قواعد کے بموجب بن سکتی ہے لیکن سلف صالحین سے چونکہ باتفاق اس کے خلاف مذکور ہے اس لیے ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں۔ رہا "گونگا ہوجانا" سو اس کے متعلق گزشتہ سطر میں نقل ہو چکا کہ یہ مسلک کسی کا بھی نہیں کہ وہ ایسے مرض میں گرفتار کر دیے گئے تھے، جس کو خرس (گونگا ہونا) کہتے ہیں، بلکہ زبان میں قوت گویائی کے صحیح سالم رہنے کے باوجود علامت کے طور پر تین دن کے لیے من جانب اللہ زبان میں (حصر) رکاوٹ واقع ہوگئی تھی۔ (قصص القرآن ص ۲۶۱ ج ۲)

جب یہ بات کسی نے کی ہی نہیں اور نہ ہی کسی کا یہ مسلک ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام مرض خرس میں مبتلا ہوگئے تھے تو مولانا آزاد کا پھر یہ خوامخواہ اعتراض کرنا اور مورد الزام ٹھہرانا کس نیک نیتی پر مبنی ہے کہ:

"قرآن نے یہ نہیں کہا کہ حضرت زکریا گونگے ہوگئے۔ یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں جو حسب معمول پیدا ہوگئیں"۔

تفسیر ابن کثیر کی عبارت منقولہ بالا میں من غیر خرس کی تصریح ہے۔ اس کے علاوہ واذکر ربك کثیرا کے پیش نظر بھی ان لاتکلم الناس کے معنیٰ خرس کے کون عاقل مراد لے سکتا ہے؟

مولانا آزاد کو متقدمین کی تفسیر پر اعتراض کے شوق نے غور و تدبر سے کام نہیں

لینے دیا اور بلاوجہ اعتراض کردیا۔ حالانکہ یہ تفسیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مفسر قرآن سے منقول ہے۔

حقیقت مسخ کے زیر عنوان مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

سورۂ بقرہ، مائدہ اور اعراف میں ہے: کونوا قردة خاسئین۔ وجعل منهم القردة والخنازير ،تو انسان کے بندر یا خنزیر ہوجانے کے کیا معنیٰ ہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے مسخ حقیقی (صوری) مراد ہے اور مشہور تابعی مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مسخ معنوی مراد ہے یعنی وہ حقیقۃً بندر کی شکل میں تبدیل نہیں ہوگئے تھے بلکہ ان کے قلوب مسخ ہوگئے تھے۔

قال مسخت قلوبهم ولم يسخوا قردة وانماهومثل ضرب الله كمثل الحمار يحمل اسفارا وهذا السند جيد من مجاهد وقول غريب خلاف الظاهر من السياق فى هٰذا المقام وفى غيره ۔(ابن کثیر ج ا) مجاہد کہتے ہیں کہ ان کے قلوب مسخ ہوگئے تھے اور وہ یعنی بندر نہیں بن گئے تھے اور دراصل یہ ایک مثل ہے جیسا کہ قرآن میں یہ مثل ہے: مثلهم كمثل الحمار يحمل اسفارا یعنی اہل کتاب کے تورات وانجیل پڑھنے اور پھر اس کے مطابق عمل نہ کرنے کی مثال ایسی ہے کہ گویا گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہیں۔ مجاہد کا یہ قول ان کی جانب صحیح سند سے ثابت ہے مگر یہ غریب، انوکھا اور اوپرا قول اور قرآن کے ان تمام مقامات کے ظاہر کے خلاف جو مختلف سورتوں میں اس سلسلہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

جمہور کے خلاف مجاہد اپنے اس قول میں منفرد ہیں اور یہ قول ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ سورۂ بقرہ میں واقعہ مسخ کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ عذاب جس طرح سرکش ونافرمان لوگوں کی پاداش عمل کے لیے یہ ضروری تھا اسی طرح اس میں یہ بھی حکمت و مصلحت تھی کہ یہ لرزہ براندام کردینے والا واقعہ گردوپیش کے رہنے والوں کے لیے

بھی سامان عبرت بن جائے، چنانچہ ارشاد ہے: فجعلناها نكالاً لما بين يديها وما خلفها۔ بس اگر مسخ کا یہ عذاب صرف مسخ قلوب تک محدود تھا تو گردوپیش کے بسنے والے کے لیے یہ کس طرح سامان عبرت مضمون بن سکتا تھا کیونکہ قلوب کے مسخ ہو جانے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ رشد وہدایت کے قبول سے محروم ہو جائے اور یہ بات دوسروں کی نگاہ میں مشاہد اور محسوس نہیں ہوا کرتی بلکہ ایک معنوی شے ہے جس کو دوسرا انسان ثمرہ یا نتیجہ اور یا کافی تجربہ کے بعد ہی معلوم کر سکتا ہے، نیز عدم قبول ہدایت کا معاملہ تو کچھ انہی لوگوں کے لیے مخصوص نہیں ہے یہ تو ہر پیغمبر کی دعوت وتبلیغ کے وقت پیش آتا رہتا ہے، لہٰذا اگر اصحاب سبت کی پیہم سرکشی کی وجہ سے ان کے قلوب مسخ کر دیے گئے یعنی ان سے قبول ہدایت سلب کر لی گئی تو ان میں وہ کیا خاص بات پیدا ہو گئی تھی کہ جس کی وجہ سے مسخ قلوب کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی کونوا قردة خاسئين۔ (قصص ص ۶۲ ج ۳)

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صحیح احادیث میں یہ آتا ہے کہ جو قومیں حیوانات کی شکل میں مسخ ہوئی ہیں وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہیں۔ (مسند احمد) یعنی مسخ کا عذاب ان کے اندر وظاہر کو اس درجہ فاسد اور گندہ کر دیتا ہے کہ وہ پھر جانبر نہیں ہو سکتیں اور جلد ہی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ (قصص ص ۶۸ ج ۳)

ابن کثیر (رحمہ اللہ تعالیٰ) حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) قتادہ، ربیع بن انس، ابوالعالیہ، ضحاک اور جمہور کے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں:

(قلت) والغرض من هذاالسياق عن هؤلاء الائمة بيان خلاف ماذهب اليه مجاهد رحمه الله من ان مسخهم كان معنويالاصوريابل الصحيح انه معنوى صورى۔ میں کہتا ہوں ان ائمہ تفسیر کے بیانات کو ذکر کرنے سے یہ مقصد ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ تمام بالاتفاق مجاہد کے قول کے مخالف نہیں کہ بنی اسرائیل کی زیر بحث جماعت کا مسخ صرف معنوی تھا، حقیقی نہ تھا۔ کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسخ معنوی اور حقیقی

دونوں حیثیت سے تھا۔

مسئلہ کا یہ پہلو نقل سے تعلق رکھتا ہے۔ رہا عقلی نقطۂ نظر سو اس کے پیش نظر بھی با آسانی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہو جانا عقلاً ناممکن اور محال نہیں ہے اس لیے کہ اس مسئلہ میں اگر عقلی استعجاب ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ایک حقیقت کس طرح دوسری حقیقت میں تبدیل ہو سکتی ہے؟ لیکن تبدیل حقائق کا یہ مسئلہ قدیم و جدید فلسفہ کے مسلمات میں سے شمار کیا گیا ہے اور فلسفہ جدید کے نظریۂ ارتقاء....کی اساس و بنیاد تو صرف اس پر موقوف ہے کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں تبدیل ہو جانا نہ صرف ممکن بلکہ کائنات ہست و بود میں واقع اور درجات ارتقاء کے لحاظ سے ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، پس اگر نظریہ ارتقاء کے اصول پر ایک گوریلا یا شمپازی قسم کا بندر اپنی حقیقت سے منتقل ہو کر انسانی حقیقت میں بدل جا سکتا ہے تو انسان کا بندر کی حقیقت میں بدل جانا کیوں محال نظر آتا ہے۔

کیا وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہر شی کا ردعمل ممکن بھی ہے اور واقع و مشاہد بھی، تو اس اصول پر اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جس طرح ایک ادنیٰ حقیقت اعلیٰ حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اسی طرح کبھی خصوصی حالات و ناموافق اثرات کی بنا پر اعلیٰ حقیقت ادنیٰ حقیقت میں منقلب ہو جاتی ہے تو عقلاء جدید کے پاس اس نظریہ کے انکار کے کون سے دلائل ہیں اور یہاں ردعمل (ری ایکشن) کیوں اپنا اثر نہیں کر سکتا؟۔(قصص ص ۶۵ ج ۳)

بہر حال ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا عقلاً کوئی مستبعد بات نہیں ہے، جو مسئلہ نسخ پر وارد ہو سکے۔ البتہ یہ امر کہ یہ واقعہ درحقیقت پیش آیا یا نہیں اس کا تعلق عقل سے نہیں ہے بلکہ علم تاریخ اور نقل صحیح سے متعلق ہے۔ اور جب کہ قرآن کریم کے علم یقین نے اس واقعہ کا بصراحت اظہار کیا اور جمہور سلف و خلف اس واقعہ کی تفسیر میں مسخ حقیقی کا اعتراف کرتے چلے آئے ہیں تو محض اس لیے کہ عام طور پر ہم ایسے واقعات

کا مشاہدہ نہیں کرتے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی شی کے مشاہدہ نہ کرنے یا اس کے زیر نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں وہ شی موجود نہیں ہے یا نہیں ہوسکتی۔ (قصص ص ۶۷ ج ۳)

ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں مسخ حقیقی سے بچنے کے لیے آیات متعلقہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ مسخ معنوی ثابت ہوتا ہے، جو کہ جمہور کے خلاف اور حسب تصریحات مفسرین ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ ''ترجمان القرآن'' سورۂ بقرہ کی آیت ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت الآیة ۔ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

''اور یقیناً تم ان لوگوں کے حال سے بے خبر نہیں ہو جو تم ہی میں سے تھے، اور جنہوں نے سبت (یعنی تعطیل اور عبادت کا مقدس دن) کے معاملہ میں راست بازی کی حدیں توڑ ڈالیں تھیں۔ (یعنی حکم شریعت سے بچنے کے لیے حیلوں اور مکاریوں سے کام لیا تھا) ہم نے کہا ذلیل وخوار بندروں کی طرح ہو جاؤ (انسانوں کے پاس سے ہمیشہ دھتکارے نکالے جاؤ گے) چنانچہ ایسا ہی ہوا''۔ (ص ۲۳۸ ج ۱)

اور سورۂ مائدہ کی آیت قل ھل اونبئکم بشر من ذٰلکم مثوبة عنداللّٰہ ومن لعنه اللّٰه وغضب علیه وجعل منهم القردة والخنازیر، الآیة ۔ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

'' (اے پیغمبر تم) کہو کیا میں تمہیں بتلاؤں اللہ کے حضور جزا کے اعتبار سے کون زیادہ بدتر ہوا؟ وہ لوگ جن پر خدا نے لعنت اور اپنا غضب اتارا اور ان میں سے کتنوں ہی کو بندر اور سور کی طرح کر دیا''۔ (ص ۴۲۴ ج ۱)

ان دونوں آیات کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے خط کشیدہ الفاظ (کی طرح) کا اضافہ ترجمہ میں اپنی طرف سے اسی لیے کیا ہے کہ آیات کا سیدھا اور صاف ترجمہ جو کہ

سیاق قرآن کریم کے مطابق ہے ''یعنی ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ، اور ان میں سے بندر اور سور بنادیا'' کو اپنی تفسیر بالرائے کی نذر کر دیا جائے اور مسخ حقیقی ثابت نہ ہو سکے حالانکہ اس جگہ کوئی حرف قرآن کریم میں تشبیہ یا مشابہت کا استعمال نہیں کیا گیا جس کا ترجمہ اس (طرح) کیا جا سکے مگر مولانا آزاد صاحب نے اپنی خواہش کے مطابق تفسیر کرنے کے شوق اور مسخ حقیقی اور تبدیل کے منکرین کو خوش کرنے کی غرض سے اپنی طرف سے تشبیہ کے کلمہ کا اضافہ کر کے کلام الٰہی میں تحریف کا ارتکاب کیا۔

مولانا آزاد نے اصول ترجمہ وتفسیر کے ضمن مفسرین پیشیں کو جن باتوں پر موردالزام ٹھہرایا ہے ان میں سے ایک یہ بات بھی ہے جس کو ان کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے کہ:

(۱) ایک طرف تو صحابہ وسلف کی روایات سے تغافل ہوا اور دوسری طرف روایات تفسیر کے غیر محتاط جامعوں نے الگ آفت بپا کر دی اور ہر تفسیر جس کا سرا کسی نہ کسی تابعی سے ملا دیا گیا، سلف کی تفسیر سمجھ لی گئی۔ (ص ۱۳)

اور لکھتے ہیں:

(۲) جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہو اس کا مطلب کیا ہے تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے خود صاحب کتاب سے مطلب سمجھا ہو.... مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا۔ بعد کے لوگوں نے اپنے عہد کے فکری مؤثرات کے تحت نئی نئی کاوشیں شروع کر دیں اور سلف کی صریح تفسیر کے خلاف ہر گوشے میں قدم اٹھا دیے۔ (ص ۱۲)

نیز لکھتے ہیں:

(۳) قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا، فطرت کی سیدھی سادھی

فکری حالت پر قانع تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل و معنیٰ میں جیسا کہ واقع ہوا تھا ٹھیک ٹھیک ویسا ہی اس کے دلوں میں اتر گیا۔ اور اسے قرآن کے فہم و معرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوئی ،صحابہ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے اور سنتے ہی اس کی حقیقت پا لیتے تھے۔ (ص۱۰)

ان تینوں اقتباسات کو بغور ملاحظہ کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ مولانا آزاد نے اپنے بیان کردہ ان اصول تفسیر کی کس حد تک موافقت کی ہے اور بڑی بے باکی سے جو الزامات وہ دوسرے مفسرین کو دیتے جاتے ہیں وہ خود بھی ان ہی الزامات کا بے تکلف مورد بنتے جاتے ہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعہ میں ان لاتکلم الناس کی تفسیر ''بغیر مرض وخرس کے تین کے لیے دن رک جانا'' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے اور اسی طرح واقعہ یوم السبت میں مسخ کا اپنے حقیقی معنیٰ پر محمول ہونا بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا گیا ہے مگر مولانا آزاد نے جلیل القدر مفسر قرآن صحابہ کی تفسیر کے خلاف اپنی آزادنہ (۱) روش جاری رکھی ،مگر دوسروں کو الزام دینے میں بڑی چابکدستی سے کام لے رہے اور لکھ رہے ہیں:

''ایک طرف تو صحابہ وسلف کی روایات سے تغافل رہا اور دوسری طرف ہر تفسیر جس کا سرا کسی نہ کسی تابعی سے ملا دیا گیا، سلف کی تفسیر سمجھ لی گئی''۔

(۱) ارشاد ہوا نشانی یہ ہے کہ تین دن تک بات چیت نہ کر مگر صرف اشارہ سے (یعنی روزہ رکھ جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا) (ترجمان القرآن ص۳۲۱ ج۱) قرآن نے یہ نہیں کہا ہے کہ حضرت زکریا گونگے ہو گئے تھے، یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں جو حسب معمول پیدا ہو گئیں۔ صاف بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت زکریا کو روزہ رکھنے اور مشغول عبادت رہنے کا حکم ہوا، اور یہودیوں کے یہاں روزہ کے اعمال میں سے ایک عمل خاموشی بھی تھی۔ (ترجمان ص۴۳۲ ج۲) ترجمان القرآن کی ان عبارات اور مولانا آزاد کی اس آزادانہ روش پر پہلے زیر عنوان ''واقعہ حضرت زکریا علیہ السلام'' پر مفصل تبصرہ گزر چکا ہے۔ ش

مولانا آزاد اس کی تفسیر پر کیا ان کی یہ بات پوری طرح صادق نہیں آ رہی ہے؟ اور کیا انہوں نے ایک صحابی کی تفسیر سے تغافل کر کے ایک ایسی تفسیر کو جس کا سرا ایک تابعی مجاہد سے ملا دیا گیا ہے اختیار نہیں کر لیا؟ درآنحالیکہ وہ تفسیر ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہے، کیا اس طرح مولانا آزاد نے صحابہ کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح دینے کی مثال قائم کی ہے، اب اس کو کس کی بدقسمتی کہا جائے؟۔قدماء مفسرین نے تو اپنی تفسیر میں صحابی کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح دی اور اس تفسیر کو اختیار کیا جس کی ظاہر قرآن سے بھی تائید ہو رہی تھی مگر اس کے برعکس مولانا آزاد نے اپنے عہد کے فکری مؤثرات کے تحت نئی نئی کاوشیں شروع کر دیں، اور سلف کی صریح تفسیر کے خلاف قدم اٹھا دیا۔

تفسیر ترجمان القرآن کا حاشیہ متعلقہ آیت ۴۹ سورۂ توبہ

ائذن لی ولا تفتنی ۔احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبر اسلام نے تبوک کا ارادہ کیا تو منافقوں کے ایک سردار جد بن قیس نے کہا: عورتوں کے معاملہ میں بہت کمزور ہوں، مجھے ڈر ہے کہ کہیں بنو اصغر کی عورتیں دیکھ کر مفتون نہ ہو جاؤں، پس مجھے رہ جانے کی اجازت دیجئے اور مجھے اس فتنہ میں نہ ڈالیے۔(ابن جریر، بنو اصغر، یعنی رومی) اس سے معلوم ہوا کہ جو باتیں کہی گئیں ہوں گی وہ اسی قسم کی ہوں گی، فرمایا یہ جھوٹے بہانے لگانے کے لیے جھوٹے فتنہ کا ذکر کرتے ہیں۔حالانکہ یہ کہہ کر اصلی فتنہ میں گر پڑے کہ راہ حق میں جہاد کرنے سے جی چرایا اور اس کے لیے جھوٹی نیکی و پرہیزگاری کی آڑ پکڑی۔

غور کرو گے تو یہ نفاق کی خصلت آج بڑے بڑے مدعیان علم و مشیخت میں بولتی نظر آئے گی۔جھوٹی دینداری اور رسمی پرہیزگاری نے سعی و عزم کی تمام راہیں ان پر بند کر دی ہیں اور وہ ساعی ہیں کہ امت پر بھی بند کر دیں۔

۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصد پر توجہ دلاؤں ممکن ہے چند اصحاب رشد و عمل نکل آئیں چنانچہ میں نے اس کی

کوشش کی لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے، ائذن ولاتفتنی ۔ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کی تھی جواب رحمت الٰہی کے جوار میں پہنچ چکی ہے۔ (ص ۹۵ ج ۲)

اس حاشیہ میں مولانا آزاد نے اپنی آزادانہ تنقید کا ہدف اپنے زمانہ کی صرف ایک شخصیت کو مستثنیٰ کر کے تمام ہی علماء ومشائخ زمانہ کو بنایا ہے، اور سب ہی بڑے بڑے مدعیان علم ومشیخت کو بقول ان کے اس ''نفاق کی خصلت'' کا مورد گردانا ہے، جس میں منافقوں کے ایک سردار جد بن قیس مبتلا تھا اور اس کے نفاق وابتلاء کی یقینی خبر وحی الٰہی کے ذریعہ قرآن کریم میں دی گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ بغیر علم وحی کے کسی شخص یا جماعت پر اس طرح نفاق کا قطعی اور یقینی حکم لگا دینا بڑی ہی جرأت وجسارت کی بات ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ مگر مولانا آزاد کے آزاد ہاتھ میں قلم ہے اور خود کو وہ اس کا مجاز سمجھتے ہیں کہ جس پر چاہیں وہ نفاق کا حکم لگا دیں اور جس کو چاہیں قرآن کریم کے بیان کردہ یقینی اور قطعی منافقوں کے زمرہ میں داخل کر کے ان کو وان جهنم لمحيطة بالكافرين کا مصداق بنا ڈالیں۔

کہاں پیغمبر اسلام کے قطعی حکم عام شرکت جہاد کی خلاف ورزی اور تعمیل حکم سے بچنے کے لیے حیلہ جوئی اور گفتار سازی اور سب سے بڑھ کر ان کا چھپا ہوا کفر ونفاق اور ارشادات نبوت پر عدم یقین کی دلی کیفیت اور کہاں ایک امتی کے دعوت کے ساتھ عدم تعاون، دونوں کو برابر قرار دینا اور دونوں کی خلاف ورزی اور عدم تعمیل پر ایک ہی طرح کا نتیجہ مرتب کر دینا غلو فی الدین ہے اور داعی کی حیثیت کو امتی کی بجائے ایک نبی کی حیثیت میں پیش کرنے کے مترادف ہے۔

جہاد تبوک میں بلا استثناء تمام مسلمانوں کو شرکت کا حکم عام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ حکم قطعی اور نص رسول کے سامنے کسی تاویل واجتہاد کی قطعاً کوئی گنجائش باقی

نہیں رہی تھی اور اس حکم قطعی عام کی تعمیل سے بچنے کے لیے حیلہ وحوالہ سے کام لینا عدم یقین اور کفر ونفاق کی وجہ سے ہی تھا اس لیے اگلی آیت وان جهنم لمحيطة بالكافرين میں صاف طور پر اس طرح کی حیلہ جوئی کرنے والوں کو کافر اور جہنمی قرار دیا گیا ہے۔

برخلاف دوسرے کسی ایسے شخص کی طرف سے دعوت جہاد کے جس کی حیثیت محض امتی کی ہو نہ وہ نبی ہے نہ وہ اس کا نائب وخلیفہ ہے، اس کے عدم تعاون کو آیت نفاق کا مصداق قرار دینا یقیناً تفسیر بالرائے اور اپنی خواہش کے مطابق قرآنی آیات کو ڈھالنا اور حدود سے تجاوز کرنا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ شرائط جہاد کے پائے جانے میں اختلاف ہوجائے، اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک شرائط نہ پائے جاتے ہوں ان کے نزدیک اس دعوت جہاد پر لبیک کہنا کیوں ضروری ہوگا؟ ایسی حالت میں قعود عن الجہاد کو منافقین کے قعود کے مثل کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور اس پر ''راہ حق میں جہاد کرنے سے جی چرانا'' کا حکم لگانا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

پھر عزیمت اور رخصت دونوں ہی شریعت کے حکم ہیں عزیمت پر عمل کرنا جس طرح پسندیدہ ہے رخصت پر عمل کرنا بھی از روئے حدیث اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہے، اب اگر کسی جماعت علماء نے عزیمت پر عمل کرلیا ہو اور دوسری جماعت رخصت پر عمل پیرا رہی ہو تو دونوں جماعتیں اپنی اپنی صوابدید کے مطابق حکم شرعی پر عامل اور اتباع شریعت پر گامزن رہی ہیں، ان میں سے کوئی جماعت بھی قابل ملامت اور لائق طعن نہیں ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے بعض عوارضات کے اعتبار سے بعض اوقات رخصت پر عمل کرنے والی جماعت اہل عزیمت سے زیادہ فضیلت حاصل کرنے والی ہو۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کا پرواز فکر اس حد تک پہنچا جہاں تک پہنچنے سے اس زمانہ کے کسی بلند سے بلند پرواز کا طائر فکر عاجز رہا اور حضرت

مولانا مرحوم کی تحریک اور عزائم کی بلندیوں تک خود مولانا آزاد ان بلند و بانگ دعاوی کے باوجود نہیں پہنچ سکے جس کا ان کو خود بھی اعتراف ہے۔ پھر زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد کے عزائم و مقاصد اور فکری رجحانات میں جو تبدیلی ہوتی رہی اور فرق نمودار ہوتا رہا وہ ان کی تحریرات کے مطالعہ کرنے والے اصحاب نظر و فکر پر روشن ہیں۔

۱۹۴۵ء وغیرہ میں آزادیٔ ہند کے فارمولے اور تجاویز مولانا کی ۱۹۱۴ء کی تحریروں کے ساتھ کسی طرح مطابقت کر سکتے ہیں؟ اہل فہم و نظر ان میں نہایت درجہ بُعد اور عدم مطابقت دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں بلکہ حیرت و استعجاب سے سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ وہی ابوالکلام آزاد ہیں جنہوں نے ۱۹۱۴ء میں دعوت جہاد کے نام سے ''الہلال'' میں اپنے مقالات کے ذریعہ سوئی قوم میں بیداری کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی؟ مگر بعد میں ان کی تحریروں اور تجویزوں کا رخ یکسر بدل چکا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۱۴ء کے ابوالکلام نہیں ہیں بلکہ یہ کوئی اور شخصیت ہے۔

کیا اس طرز عمل کے اختلاف اور روش کے بدل جانے سے یہ نتیجہ نکال لینا درست نہ ہوگا کہ یہ سب کچھ دعوت جہاد وغیرہ فتنہ تھا۔ اور اخلاص کی بجائے نفاق پر مبنی تھا؟

....

نوٹ

حضرت والد صاحب قدس سرہ کے مسودات میں یہ مقالہ یہیں تک ملا ہے، غالباً حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اس میں مزید اضافات بھی فرمانا چاہتے تھے، لیکن دیگر مشاغل کی وجہ سے اس کی فرصت نہ ملی۔ ہمیں اب جتنا مقالہ ملا وہ شائع کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ نافع و مفید اور مقبول فرمائیں۔ حضرت والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت کو قبول فرما کر ان کے رفع درجات کا سبب بنائیں، آمین

احقر عبدالقدوس ترمذی غفرلہ

۱۷ر شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ

حضرت مولانا مفتی شیر محمد علوی مدظلہم ۔ لاہور

ہندوستان کا ایک یادگار سفر

مولانا مفتی محمد مظہر اسعدی صاحب کا بہاولپور سے فون آیا کہ حضرت اقدس مولانا سید ارشد مدنی کی دعوت پر انڈیا جانا ہے تو کیا خیال ہے؟ احقر نے فوراً حامی بھر لی۔ مگر احقر کا پاسپورٹ عمرے کا ویزہ لگنے کے لئے گیا ہوا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ کہ فوراً واپس منگوائیں۔ احقر نے اپنا پاسپورٹ واپس منگوایا اور مولانا کو ای میل کر دیا۔ کئی روز کے بعد بہرحال ویزہ لگ کر آ گیا تو احقر نے عمرے کا ویزہ بھی لگوالیا اور مولانا سے مشورہ کر کے عمرے کے لئے ۲۱ مارچ ۲۰۱۴ء کو روانہ ہو گیا۔ کہ ۴/اپریل کو واپسی لازمی ہے، کیونکہ ۵/اپریل بروز ہفتہ کو انڈیا کا سفر کرنا ہے۔ چنانچہ حسبِ پروگرام ۴/اپریل بروز جمعۃ المبارک واپس لاہور پہنچ گیا اور جمعہ اپنی مسجد نوابدین میں پڑھایا۔ اور اگلے روز یعنی بروز ہفتہ ۵ اپریل کو برخوردار مولوی محمد ابوبکر علوی سلمہ کی گاڑی میں تقریباً ۷:۳۰ بجے روانہ ہوا ۸:۳۰ بجے واہگہ بارڈر پہنچ کر دیگر احباب کا انتظار کیا۔ جب سب احباب تشریف لے آئے اور بارڈر کھلا تو تقریباً ۹:۳۰ بجے صبح سرحد پار کی گئی۔

واہگہ بارڈر پر

جب ہم نے بارڈر کراس کر لیا اور ایمیگریشن کے ہال میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت مولانا سید اسجد مدنی زید مجدھم استقبال کے لئے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد حضرت بنفسِ نفیس ایمیگریشن ہال میں تشریف لے آئے اور وفد کے سب ارکان سے ملاقات فرمائی۔ اور ایمیگریشن والوں کو بھی تاکید فرمائی کہ ہمارے مہمانوں کو جلدی فارغ کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ایمیگریشن کے عملہ نے نہایت خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے سارے قافلے کو فارغ کیا، اور ہم اپنا اپنا سامان لے کر ایمیگریشن ہال

سے جب باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ حضرت مولانا اسجد مدنی زید مجدھم اکیلے تشریف نہیں لائے بلکہ آپ کی قیادت میں جمعیت علماء پنجاب کے صدر اور ریاست مالیر کوٹلہ کے سرکاری مفتی مولانا مفتی ارتقاء الحسن کاندھلوی اور مولانا حامد صاحب خطیب جامع مسجد خیر الدین امرتسر، اور مولانا مفتی شہاب الدین قاسمی وغیرہ علماء بھی تشریف لائے ہوئے ہیں ۔ چنانچہ ان حضرات سے ملاقات ہوئی۔ مفتی ارتقاء الحسن سلمہ سے دیرینہ تعلق ہے۔

وفد کو لے جانے کے لئے ائیر کنڈیشنڈ گاڑیوں کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ سامان گاڑیوں میں رکھا گیا اور قافلے کے شرکاء گاڑیوں میں سوار ہو گئے ۔ جب ایمیگریشن کے احاطے سے باہر نکلے تو جمعیت علمائے ہند پنجاب کے بیسیوں کارکن اور خدام استقبال کے لئے لائن بنا کر کھڑے تھے ۔ گاڑیاں روکی گئیں، سب حضرات گاڑیوں میں سوار ہوئے اور شرکائے قافلہ سے ملاقات کر کے دعاؤں کی درخواست کرتے رہے۔

قافلہ مسجد خیر الدین امرتسر میں

اب قافلہ اٹاری سے فارغ ہوکر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوا ۔ حضرت مولانا صاحبزادہ سید اسجد مدنی دامت برکاتہم نے بتلایا کہ پروگرام یہ طے کیا ہوا ہے کہ ظہر کی نماز اور کھانا مسجد خیر الدین میں ہے ۔ چنانچہ ہم لوگ تقریباً ۲ بجے مسجد خیر الدین امرتسر میں اترے اور سامان گاڑیوں میں ہی رہا۔ مسجد میں وضو کیا اور ظہر کی نماز چونکہ مسجد کی ہو چکی تھی، اس لیے ہم لوگوں نے مسجد کے متعلقہ شمالی جانب کے برآمدے میں اپنی جماعت کروائی اور امامت کی سعادت اللہ تعالیٰ نے خادم کو نصیب فرمائی ۔ اس کے بعد جنوبی جانب کے برآمدے میں نہایت پر تکلف کھانے کا اہتمام تھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر مسجد کے ہال میں سب حضرات نے تھوڑی دیر کے لئے استراحت فرمائی۔

جامع مسجد خیر الدین

مسجد خیر الدین ایک قدیمی اور تاریخی مسجد ہے جس میں تقسیم سے پہلے مدرسہ

نعمانیہ قائم تھا، جس کے بانی اور ذمہ دار حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ تھے اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ جیسے حضرات یہاں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس تاریخی مسجد میں حاضری کے وقت بہت زیادہ مسرت اور انبساط محسوس ہو رہی تھی۔ تقسیم کے بعد حضرت مفتی صاحب لاہور تشریف لائے اور جامعہ اشرفیہ لاہور کی داغ بیل ڈالی جو آج بحمداللہ پاکستان کے بڑے جامعات میں سے ایک ہے۔ مسجد خیر الدین سے قبیلِ عصر ریلوے اسٹیشن کے لئے روانگی ہوئی، شتابتی ایکسپریس میں پہلے سے سیٹیں بک تھیں۔ اپنی اپنی سیٹوں پر جاتے ہی بیٹھ گئے اور یہ قافلہ اب شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ کے چھوٹے صاحبزادے حضرت مولانا سید اسجد مدنی کی قیادت میں دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ جالندھر کے قریب پہنچ کر عصر کی نماز ریل کے اندر ہی باجماعت ادا کی گئی۔ اور اس کے بعد ریلوے کی طرف سے پینے کا پانی اور چائے پیش کی گئی۔ لدھیانہ کے قریب حضرت مولانا سید اسجد مدنی کی امامت میں ریل ہی میں نمازِ مغرب ادا کی۔ اس ریل کا سفر انتہائی آرام دہ اور خوشگوار تھا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ہماری پی آئی اے کی پروازوں سے اس کا سفر زیادہ آرام دہ تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ رات تقریباً گیارہ بجے دہلی اسٹیشن پر اترے تو ہماری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ آل انڈیا جمعیت علمائے ہند کے صدر اور حضرت مدنی قدس سرہ کے صحیح جانشین دارالعلوم دیوبند کے استاذ الحدیث مخدوم العلماء حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم جمعیت کے سینکڑوں علماء اور کارکنوں کے ساتھ دہلی اسٹیشن پر استقبال کے لئے بنفسِ نفیس موجود تھے۔ وفد کے تمام حضرات سے حضرت نے معانقہ مصافحہ فرمایا اور خیریت پوچھی۔ اور پھر سب حضرات کا سامان اپنی نگرانی میں گنتی کروا کر قلیوں کے حوالے کیا۔ اور قافلہ اب ان کی قیادت میں دہلی اسٹیشن سے باہر نکلا تو قافلے کے لئے پہلے سے گاڑیوں کا انتظام موجود تھا۔ گاڑیوں میں سوار ہو کر اسلامک کلچر سنٹر جو فائیو سٹار ہوٹل سے کم نہیں اس میں رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ دو دو حضرات کو ایک ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔

چونکہ ہم لوگوں نے عشاء کی نماز ابھی تک ادا نہیں کی تھی اس لئے اپنے اپنے کمرے میں سب نے باجماعت نماز ادا کی اور حضرت کے حکم کے مطابق آرام کے لئے لیٹ گئے۔

حضرت مولانا کا عجیب مجاہدہ

ہمیں حضرت آرام کے لئے فرما کر تقریباً رات دو بجے دیوبند کے لئے روانہ ہو گئے، صبح مولانا اسجد زید مجدھم سے معلوم ہوا کہ حضرت نے چونکہ ترمذی کا سبق پڑھانا تھا کہ حضرت ہفتے کو دہلی آئے سبق پڑھا کر، اور پھر رات دو بجے اتوار کا سبق پڑھانے کے لئے دیوبند روانہ ہو گئے۔ تو معلوم ہوا کہ حضرت کا معمول ہے کہ سبق پڑھا کر دوسرے تیسرے روز جمعیت کے کام کے لئے دہلی تشریف لاتے ہیں اور پھر واپس دیوبند تشریف لے جاتے ہیں تاکہ دارالعلوم کے اسباق کا حرج نہ ہو۔ حضرت کے اس مجاہدے سے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا مجاہدہ یاد آتا ہے۔ اللھم زد فزد

فجر کی نماز اپنے اپنے کمروں میں ہی باجماعت پڑھ کر فارغ ہوئے تو حضرت مولانا اسجد مدنی تشریف لائے اور فرمایا کہ ساڑھے چھ بجے زیارات کے لئے جانا ہے اور واپس آکر جمعیت کے مہمان خانے میں ناشتہ کرنا ہے۔ چنانچہ تقریباً ساڑھے چھ بجے حضرت کے فرستادہ رہبروں کے ساتھ تبلیغی مرکز نظام الدین میں حاضری ہوئی جہاں حضرت مولانا زبیر الحسن رحمہ اللہ کی ان کے صاحبزادگان سے تعزیت کی۔ اتنے میں تبلیغی بزرگ حضرت مولانا احمد لاٹ صاحب اور مولانا ابراہیم صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب استاذ الحدیث دار العلوم دیوبند بھی حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب مرحوم کے کمرے میں تشریف لے آئے۔ تمام حضرات سے ملاقات ہوئی، اس کے بعد حضرت مولانا الیاس صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب، مولانا انعام الحسن صاحب، مولانا زبیر الحسن مرحومین کے مزارات پر حاضری اور فاتحہ کی سعادت حاصل کی۔ مولانا زبیر الحسن صاحب رحمہ اللہ کے بڑے صاحبزادے مولانا زہیر الحسن صاحب نے عجوہ کھجور اور آبِ زمزم سے قافلے کا اکرام فرمایا اور دیگر بزرگوں نے

بھی ناشتے کے لئے بہت اصرار فرمایا مگر مولانا اسجد صاحب کی طرف سے پابندی تھی کہ ناشتہ جمعیت کے مہمان خانے میں کرنا ہے اس لئے ناشتہ سے معذرت کر دی گئی۔ پھر سارا قافلہ شیخ المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ کی درگاہ پر حاضر ہوا۔ حضرت کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھی اور ساتھ ہی حضرت خواجہ ابوالحسن خسرو دہلوی رحمہ اللہ کے مزار پر بھی ایصالِ ثواب کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہیں پر اپنے قدیمی مہربان دوست اور خواجہ صاحب کے سجادہ نشین حضرت سید ناظم علی نظامی سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بہت محبت اور شفقت کا اظہار فرمایا۔ یہاں سے فارغ ہوکر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ کے مزار پر حاضری کی سعادت حاصل کی، پھر قبرستان مہندیاں میں جاتے ہوئے راستے میں قطب مینار کی بھی زیارت ہوئی۔

قبرستان مہندیاں میں حاضری

اس مقدس قبرستان میں حاضری کے وقت عجیب کیفیت تھی کہ اس میں متحدہ ہندوستان کے استاذ الاساتذہ حضرات آرام فرما ہیں۔ چنانچہ قبرستان میں حاضری ہوئی جس میں مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے صاحبزادگان حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، شاہ عبدالغنی محدث دہلوی اور مجاہدِ اعظم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید کے صاحبزادے شاہ محمد عمر اور دیگر اکابر ولی اللہی خاندان کے مزارات پر حاضری اور سلام کی سعادت حاصل کی۔ انہیں میں شاہ ولی اللہ کے والدِ محترم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب بھی آرام فرما ہیں۔ نیز حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور تحریکِ آزادی کے مجاہدِ اعظم حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور استاذ الکل فی الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب کی خدمت میں بھی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی قبرستان سے متصل حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے والدِ محترم کا قائم فرمودہ مدرسہ جامعہ رحیمیہ بھی ہے۔ اس کی زیارت سے بھی مشرف ہونے کا اللہ تعالیٰ نے موقع عطا فرمایا۔

اب یہاں سے واپسی پر جمعیت کے مہمان خانہ میں حاضری ہوئی۔ یہاں نہایت پر تکلف ناشتے کا اہتمام تھا۔ خاص طور پر دہلی کی نہاری سے تمام حضرات خوب متاثر ہوئے اور ہر ایک کی زبان پر یہ جملہ تھا کہ ایسی نہاری کبھی نہیں کھائی۔

یہ سب اہتمام صدر جمعیت حضرت مولانا سید ارشد مدنی اور ان کے برادر حضرت مولانا سید اسجد مدنی کے خلوص اور محبت کا کرشمہ ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر پھر اسلامک سنٹر میں پہنچے اور ظہر کی نماز اول وقت میں باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد تقریباً دو بجے قافلہ عازمِ دیوبند ہوا۔ ہم لوگ گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب قدس سرہ کے نواسے اور مظاہر علوم سہارنپور کے امینِ عام حضرت مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری سہارنپور سے ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ کھڑے کھڑے ان سے ملاقات ہوئی اور قافلہ مولانا سید اسجد مدنی زید مجدھم کی قیادت میں دیوبند کے لئے روانہ ہوا۔ راستے میں میرٹھ مظفر نگر بائی پاس سے نکلتے ہوئے کھتولی پہنچا۔

نوٹ: کھتولی اصل میں لفظ خطہء ولی تھی۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کے خاندان کی نسبت سے خطہء ولی تھا لیکن کثرت استعمال کی وجہ سے کھتولی بن گیا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق یہاں پر ایک مسلمان غالباً رانا عباس نام ہے ان کا ہوٹل زیرِ تعمیر ہے اس کا افتتاح اس وفد سے کرانا تھا، چنانچہ اس نئے تعمیر ہونے والے ہوٹل میں نہایت پر تکلف چائے اور اس کے لوازمات سے قافلے کی ضیافت کی گئی۔ اور عصر کی نماز اسی میں باجماعت ادا کی۔ رانا صاحب نہایت دین دار اور صاحب ثروت شخص ہیں اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی زید مجدھم اور دیگر علماء کے نہایت محبّ اور مخلص ہیں۔ انہوں نے اپنی مسرت اور خوشی کا اظہار اس انداز سے کیا کہ گویا آج ان کے لئے عید کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہر قسم کے شر وفتنہ سے محفوظ رکھے، آمین! موصوف کا ایک ہوٹل سڑک کی دوسری جانب نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی برکات سے ان کو اور تمام مسلمانوں

کو مالا مال فرمائے، آمین۔

اب یہاں سے قافلہ دیوبند کے لئے روانہ ہوا۔ دیوبند کی آبادی سے باہر ہی کچھ آثار ایسے محسوس ہورہے تھے کہ گویا پورا شہر اس قافلے کے استقبال کے لئے جمع ہے۔ چنانچہ شہر میں داخل ہوئے تو استقبالی پارٹیاں پھول لے کر قافلے کی طرف بڑھنی شروع ہوئیں اور گاڑیوں پر گل پاشی شروع کردی۔ دارالعلوم کے مہمان خانے تک پہنچنے میں ہجوم کی وجہ سے کافی دیر لگ گئی۔ اس ہجوم میں دارالعلوم کے اساتذہ طلباء اور شہر کے لوگ شامل تھے۔ ان کا جوش و ولولہ اور جذبہء محبت قابلِ دید تھا، اور کثرت سے یہ نعرہ لگایا جارہا تھا:

سربکف سربلند دیوبند دیوبند، علمائے دیوبند زندہ باد، علمائے پاکستان زندہ باد، نعرۂ تکبیر!

اس جوش وخروش کو دیکھ کر حضرت مولانا سید ارشد مدنی کی مقبولیت کا اندازہ ہوا کہ علماء طلباء اور دیگر مسلمانوں میں اپنے والد گرامی حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی قبولیتِ عام عطا فرمائی ہے۔ اللھم زد فزد!

قافلے کو بڑی مشکل سے ہجوم سے نکال کر مہمان خانے تک پہنچایا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کا مہمان خانہ

مہمان خانے میں کئی کمرے ہیں، بعض کمروں میں دو دو حضرات کو اور بعض کمروں میں کچھ زیادہ کو ٹھہرایا گیا۔ چونکہ مسجد میں مغرب کی جماعت ہوچکی تھی اس لئے ہم لوگوں نے مہمان خانے کے ہال میں ہی مغرب کی نماز باجماعت ادا کی۔ نماز کے بعد کثرت سے طلباء علماء قافلے سے ملنے کے لئے مہمان خانے میں تشریف لاتے رہے اور قافلے والے حضرات سے دعاؤں کی درخواست اور اپنے سروں پر ہاتھ پھروانا عاجزی انکساری کا خوب مظاہرہ ہوا۔ اسی دوران دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (مدیر رسالہ دارالعلوم) حضرت مولانا نعمت اللہ محدث، حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی نائب مہتمم، حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی نائب مہتمم نمبر۲ اور دیگر اکابر علماء

اور شیوخِ حدیث ملاقات کے لئے تشریف لائے ۔ اتنے میں عشاء کی اذان ہوئی اور دارالعلوم کی قدیمی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کی اللہ تعالیٰ نے سعادت نصیب فرمائی۔ مسجد کیا تھی بقعہءنور تھا۔علماءطلباء جوق در جوق مہمانوں سے ملتے اور مسجد کے در و دیوار سے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ رحمتوں کی بارش نازل ہو رہی ہے۔نمازِ عشاء سے فارغ ہونے کے بعد پھر مہمان خانے میں واپسی ہوئی اور ہال کمرے میں کھانے کا انتظام تھا۔حضرت مہتمم صاحب بھی اور دیگر اکابر بھی کھانے میں شریک تھے ۔اس کھانے کی مجلس میں بھی خوب اخلاص، شفقت، محبت اور للّٰہیت نظر آتی تھی ۔اور بعض علمی لطائف ظرائف بھی علمائے کرام بیان فرماتے رہے۔ یہ سب اخلاص تھا حضرت مولانا ارشد مدنی اور انکے برادرِ عزیز حضرت مولانا سید اسجد مدنی اور ان کے صاحبزادگان کا کہ یہ سب حضرات خدام بن کر مہمانوں کے اکرام وغیرہ میں مشغول تھے اور ہر ایک کا اخلاص و محبت قابلِ دیدنی تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے مگر علماء، طلباء کا ہجوم کم نہیں ہوا، بالآخر مجبور ہو کر تقریباً رات گیارہ بجے مہمان خانے کے ذمہ داروں نے آنے والے حضرات سے معذرت کی اور دروازے بند کئے تاکہ مہمان حضرات آرام کرسکیں۔سحری کے وقت اللہ تعالیٰ نے اٹھنے کی توفیق عطا فرمائی، اپنے معمولات مہمان خانہ ہی میں پورے کئے ۔اتنے میں فجر کی اذان ہوگئی، اذانِ فجر کے بعد مسجد کا رخ کیا۔خیال ہوا کہ مسجد چھتہ میں فجر کی نماز ادا کی جائے۔

مسجد چھتہ

ایک تو اس تاریخی مسجد کی زیارت اور اس کی برکات حاصل کرنا مقصود تھا۔دوسرے اپنے شیخ حضرت مولانا حافظ محمد طیب صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری اور زیارت۔ کیونکہ معلوم ہوا تھا کہ حضرت حافظ صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی خانقاہ اسی مسجد میں ہے۔حضرت حافظ صاحب شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مدنی قدس سرہ کے خلیفہ مجاز ہیں

اور احقر کے شیخ ہیں۔ بہرکیف مسجد میں حاضری ہوئی۔ نماز باجماعت ادا کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد کے اگلے ہال کی بتیاں بند کردی گئیں جس میں ذاکرین حضرات اپنے اپنے طور پر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوگئے۔ اور یہ ہال ذاکرین سے بھرا ہوا تھا اور دوسرے ہال کی بتیاں روشن تھیں جس میں تلاوتِ کلام پاک کرنے والے حضرات تلاوت میں مشغول ہوگئے اور باہر صحن میں طلباء اپنے تکرار ومطالعے میں مشغول ہوگئے، لیکن حضرت شیخ حافظ صاحب زید مجدھم چونکہ آنکھوں سے معذور ہیں اور کوئی لانے والا بھی نہیں تھا اس لئے فجر کی نماز میں تشریف نہ لا سکے۔ احقر ایک طالب علم کو ساتھ لے کر حضرت کے مکان پر حاضر ہوا۔ حضرت سے ملاقات ہوئی، کچھ دیر حضرت کی خدمت میں رہا پھر اجازت لے کر مہمان خانے میں حاضر ہوا، کیونکہ یہاں ناشتے پر انتظار ہورہا تھا۔

چھتہ مسجد وہ تاریخی مسجد ہے جس کے دروازے پر ایک انار کے درخت کے نیچے دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا ایک استاد اور ایک شاگرد سے۔ اور عجیب اتفاق کی بات ہے کہ دونوں کے نام میں اشتراک ہے۔ استاد کا نام حضرت مولانا محمود دیوبندی اور شاگرد حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، جو کہ بعد میں شیخ الہند کے عنوان سے معروف ومشہور ہوئے۔ اسی مسجد میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی خانقاہ اور خلوت گاہ ہے۔ جس کو آجکل احقر کے شیخ حضرت حافظ صاحب دامت برکاتہم عالیہ فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی قدس سرہ کے حکم سے آباد فرما رکھا ہے۔ اس پاکیزہ مسجد میں بھی عجیب وغریب قسم کے انوارات، برکات اور سکون وراحت محسوس ہوئے۔

ناشتے کے بعد نانوتہ اور گنگوہ شریف وغیرہ کے لئے روانگی

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مخدوم محترم حضرت مولانا سید اسجد مدنی دامت برکاتہم العالیہ نے فرمایا کہ گاڑیاں تیار ہیں سب حضرات گاڑیوں میں بیٹھیں، چنانچہ سب حضرات گاڑیوں میں بیٹھ گئے اور حضرت پہلے اپنے ادارے میں لے گئے جو کہ بچیوں کی

تعلیم وتربیت کا اعلیٰ معیاری ادارہ ہے اوراس میں سینکڑوں بچیاں قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر کے علاوہ عصری تعلیم وتربیت حاصل کررہی ہیں۔ کھڑے کھڑے اس ادارے میں دعا ہوئی اوراس کے بعد حضرت کے صاحبزادہ محترم مولانا سید حسن مدنی کی رہبری میں نانوتہ کے لئے روانہ ہوئے۔ نانوتہ تاریخی قصبہ ہے جس کو حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی قدس سرہ کی نسبت سے دنیا میں شہرت حاصل ہوئی۔

نانوتہ پہنچ کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کے مزارات پر حاضری ہوئی۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب استاد الکل فی الکل مولانا مملکوک علی صاحب رحمہ اللہ کے صاحبزادے ہیں اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ثم المدنی رحمہ اللہ کے ماموں ہیں۔ اور دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں اور سب سے پہلے صدر مدرس اور مفتی تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرھما کے استادِ محترم ہیں اور نہایت ہی باکرامت بزرگ ہیں۔ یہاں سے فاتحہ وغیرہ سے فارغ ہوکر قافلہ گنگوہ شریف کی طرف روانہ ہوا، راستے میں ہلکی ہلکی بارش بھی ہوتی رہی جس کی وجہ سے موسم میں بہت ہی خوشگواری پیدا ہوگئی، کچھ دیر بعد گنگوہ شریف پہنچ گئے۔ سب سے پہلے حضرت مولانا سید ارشد مدنی کے قائم فرمودہ مدرسہ میں حاضری ہوئی۔ اس مدرسہ کے ذمہ دار حضرت کے صاحبزادے مولانا سید حبیب اللہ ہیں۔ مدرسہ کے طلباء اور اساتذہ نے نہایت پرتپاک طریقے سے قافلے کا استقبال فرمایا اور نہایت پرتکلف چائے اوراس کے لوازمات سے تواضع فرمائی۔ اس کے بعد امام ربانی قطب الارشاد ابوحنیفہء وقت، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نوراللہ مرقدہ کے مزارِ پرانوار پر حاضری ہوئی آپکے قدموں میں آپکی صاحبزادی حضرت صفیہ (حضرت کیا کرتے تھے کہ اگر عورتوں کو خلافت دی جاتی تو میں اپنی بیٹی صفیہ کو خلافت دیتا) اور آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا حکیم مسعود احمد اور حضرت کے پوتے حضرت مولانا حکیم عبدالرشید

محمود عرف حکیم ننومیاں خلیفہ ءمجاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بھی آرام فرما ہیں۔ ان حضرات کی خدمت میں سلام اور فاتحہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی ۔حضرت گنگوہی قدس سرہ کے مزار پرانوار پر عجیب کیفیت محسوس ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان حضرات کے درجات کو بہت زیادہ بلند فرمائے۔آمین۔

ایک صاحب نے ذکر فرمایا کہ حضرت کے مزار کے آس پاس کے مکانات اور زمین حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہم نے لاکھوں روپے میں خرید کر ایک بہت بڑا دینی ادارہ قائم فرمادیا ہے اور حضرت ہی کے نام سے پورے قصبے میں بیسیوں مدرسے قائم ہیں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سہارنپور کے لئے روانگی ہوئی راستے میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری ثم المدنی کا آبائی قصبہ انبھیٹھہ پیرزادگان پڑتا ہے، اس کی بھی زیارت نصیب ہوئی۔اس تاریخی قصبے کے اندر بھی حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم العالیہ نے کئی ایکڑ رقبے پر ایک دینی مدرسہ قائم فرمارکھا ہے۔اس مدرسے میں بھی حاضری ہوئی ۔ مدرسے کے ذمہ داران اساتذہ اور طلباء نے قافلے کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور وقت کی مناسبت سے چائے اور فروٹ اور دیگر مشروبات سے تواضع کی گئی ۔معلوم ہوا کہ اس مدرسے کے ذمہ دار بھی حضرت مولانا سید ارشد مدنی کے ایک صاحبزادے ہیں۔ابھی مدرسے کی تعمیر جاری ہے۔اللہ تعالیٰ جلد اس کو پایہء تکمیل تک پہنچائے اور شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔آمین!

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد قافلہ سہارنپور کی طرف روانہ ہوا اور تقریباً بارہ ساڑھے بارہ بجے حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی کے مکان اور خانقاہ میں حاضری ہوئی اور دوپہر کے کھانے کا انتظام پہلے سے حضرت کے ہاں طے تھا۔ چنانچہ وہاں پہنچتے ہیں حضرت نے کھانا لگوادیا جو انتہائی پرتکلف تھا۔کھانے سے فارغ ہوکر دوسرے عظیم الشان تاریخی مرکزِ اسلام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے ۔ظہر کی نماز کا وقت

قریب تھا جب مدرسے میں پہنچے تو جامعہ کے طلباء اور اساتذہ نے والہانہ استقبال فرمایا۔ قافلے نے وضو کیا اور ظہر کی نماز جامعہ میں باجماعت ادا کی، اور اس کے بعد جامعہ کے مہمان خانے میں چائے وغیرہ کے ساتھ قافلے کا اکرام کیا گیا۔ اتنے میں حضرت مولانا شیخ الحدیث زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ کے داماد اور خلیفہ اور جامعہ کے صدر المدرسین حضرت مولانا محمد عاقل صاحب شارح سنن ابی داؤد بھی تشریف لے آئے۔ حضرت سے ملاقات ہوئی اور بہت زیادہ اکرام فرمایا۔ حضرت کے ساتھ احقر کے بہت قدیمی تعلقات ہیں اسی طرح حضرت کے صاحبزادگان کے ساتھ بھی۔ یہاں فارغ ہو کر حضرت شیخ الحدیث کے نواسے مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری کے صاحبزادگان محمد صالح اور محمد یاسر کی فرمائش پر ان کے قائم فرمودہ مدرسہ زکریا میں حاضری اور دعا ہوئی۔ مدرسہ بالکل نومولود ہے مگر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید ترقیات سے مالامال فرمائے۔ آمین۔ (جاری......)

....

مولانا محمد آصف چنیوٹی

اخبارالجامعہ

یکم رجب المرجب: حضرت مدظلہم نے مدرسہ حفصہ للبنات پٹھان کوٹ ساہی وال میں بخاری شریف کی آخری حدیث مبارکہ پردرس ارشادفرمایا۔۶:حضرت مدظلہم نے مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ مبارے خان ساہی وال میں بخاری شریف کی آخری حدیث مبارکہ پردرس ارشادفرمایا۔ ۷:حضرت مدظلہم مدرسہ ام ہانی نور پورتھل میں بخاری شریف کی آخری حدیث مبارکہ کا درس ارشاد فرمایا۔حضرت مدظلہم نے موضع چوہال میں مشکوٰۃ شریف کی آخری حدیث مبارکہ کا درس ارشاد فرمایا۔حضرت مدظلہم نے شاہ پورصدر میں جمعہ کے موقع پر بیان فرمایا۔نماز جمعہ کے بعد حضرت مولانا زبیرالحسن صاحب دامت برکاتہم فاضل دارالعلوم دیوبند سے ملاقات کی۔۱۰:حضرت مدظلہم نے دارالعلوم حقانیہ چنیوٹ میں حفظ قرآن کریم کی تقریب سے بیان فرمایا۔۱۱:حضرت مدظلہم نے جامعہ محمودیہ اور جامعہ سراج العلوم سرگودھا بیانات فرمائے۔۱۲۔۱۳:حضرت مدظلہم دوروزہ اصلاحی دورہ پرملتان ،ڈیرہ غازی خان،جام پور،شکارپورتشریف لے گئے ۔اورمختلف جگہوں پراصلاحی بیانات فرمائے۔۱۵:حضرت مدظلہم نے مدرسہ قادریہ ڈھڈیاں میں بخاری شریف کی آخری حدیث مبارکہ پردرس ارشادفرمایا۔۱۷:حضرت مدظلہم نے مدرسہ دارالعلوم محمدیہ واہ فیکٹری میں بیان فرمایا۔ ۱۹:وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے تحت جامعہ میں درجہ حفظ کا سالانہ امتحان ہوا،جس میں طلباء وطالبات نے شرکت ۔۲۰:حضرت مدظلہم نے مدرسہ مدینۃ العلوم سرگودھا میں درجہ حفظ کے پانچ طلباءکوقرآن کریم کا آخری سبق پڑھا کر بیان فرمایا۔۲۱:حضرت مدظلہم نے مدرسہ امدادیہ فتحیہ سلانوالی میں بخاری شریف کی آخری حدیث پردرس ارشادفرمایا۔۲۴:وفاق المدارس کے تحت درجہ کتب کا سالانہ امتحانات شروع ہوئے ،جس میں طلباءوطالبات کی کثیر تعدادشریک ہوئی ۔طالبات کاامتحانی مرکز جامعہ میں ہی تھا جبکہ طلبہ امتحان کے لیے جامعہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا روانہ ہوئے۔

کارروائی سالانہ جلسہ تقسیم اسناد ۱۴۳۵ھ

حسب سابق اس سال بھی جامعہ حقانیہ کا ۶۰ واں سالانہ جلسہ اپنی روایتی آب وتاب کے ساتھ ۳۰؍رجب المرجب؍یکم شعبان المعظم کومنعقد ہوا۔

پہلی نشست کا آغاز جمعہ کے موقع پر جامع مسجد حقانیہ میں حضرت اقدس مولانا مشرف علی تھانوی صاحب دامت برکاتہم کے بیان سے ہوا۔خطبہ جمعہ اور نماز جمعہ کی امامت حضرت مولانا قاری محمود احمد صاحب مدظلہم نے فرمائی۔

دوسری نشست عصر کی نماز کے بعد جامعہ حقانیہ فروکہ روڈ پر منعقد ہوئی جس میں حضرت مولانا مشرف علی تھانوی مدظلہم نے اصلاحی درس ارشاد فرمایا۔

تیسری نشت یکم شعبان المعظم بروز ہفتہ بعد نماز ظہر ہوئی جس میں اولاً حضرت مولانا مفتی محمد طیب صاحب عارفی مدظلہم نے بیان فرمایا۔ان کے بعد مناظر اسلام حضرت مولانا علامہ محمد عبدالغفار تونسوی دامت برکاتہم کا تفصیلی بیان ہوا۔

چوتھی اور آخری نشست کا آغاز عشاء کی نماز کے بعد جامعہ کے طالب علم مولوی حماد اللہ سلمہ کی تلاوت سے ہوا۔ پھر حضرت مولانا اشرف علی صاحب اور حضرت مولانا خلیل الرحمٰن انوری مدظلہما کے بیانات ہوئے۔اس کے بعد مولانا مفتی طاہر مسعود صاحب مدظلہم نے جامعہ کا تعارف نامہ پیش فرمایا۔ پھر درجہ تخصص، دورہ حدیث شریف، درجہ کتب اور درجہ حفظ کے طلباء کو اسناد تقسیم کی گئیں اور فارغ ہونے والے طلبہ کی دستار بندی کی گئی اور حفاظ کرام کو رومال دیا گیا۔ بعد ازاں حضرت مولانا مشرف علی تھانوی مدظلہم نے طلبہ وطالبات کو اجازت حدیث عطا فرمائی۔ پھر آخر میں حضرت مولانا قاضی عبدالرشید صاحب مدظلہم نے مدارس دینیہ کے حوالہ سے پراثر بیان فرمایا اور حضرت قاضی صاحب مدظلہم کی دعا پر یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس گلشن کو ہمیشہ یونہی لہلہاتا اور آباد رکھیں اور اس کے فیض کو عام اور تام فرمائیں، آمین ثم آمین۔

ع۔ن۔ت

تعارف کتب

نام کتاب: تفسیر مظہری اردو (۲ جلد از سورۂ فاتحہ تا سورۂ مائدہ) صفحات: ج ۱: ۶۸۰ رج ۲: ۶۸۸
تشریحی ترجمہ: حضرت مولانا سید عبدالدائم الجالی ناشر: مکتبہ لدھیانوی بنوری ٹاؤن کراچی

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔آپ صرف سولہ سال کی عمر میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اور تمام علوم عقلیہ ونقلیہ کے عالم باعمل تھے۔آپ نے حدیث کی تکمیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور سلوک وطریقت کے منازل حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمہ اللہ کے ہاتھ پر طے کیے۔ زیر نظر کتاب حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ کی تحریر کردہ عربی تفسیر کا اردو ترجمہ ہے۔

ناشر اس تفسیر کے متعلق رقم طراز ہیں: حضرت قاضی صاحب کی اگرچہ تیس سے زائد تصانیف ہیں جو تفسیر، فقہ اصول فقہ، حدیث، تصوف وسلوک وغیرہ پر مشتمل ہیں، مگر سب سے زیادہ شہرت ''التفسیر المظہر ی'' کو حاصل ہے جو ایک علمی شاہکار ہے۔تیرہ سال میں تکمیل پانے والی یہ تفسیر اپنے شیخ حضرت مرزا مظہر جاناں کی طرف منسوب ہے، جس میں قدیم مفسرین کے اقوال اور جدید تاویلات اور فقہی مسائل کا استنباط کیا گیا ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی تفسیر مظہر کے متعلق لکھتے ہیں:

میں نے جتنی تفاسیر دیکھی ہیں اور الحمد للہ کہ بیان القرآن لکھنے کی ضرورت سے بکثرت دیکھی ہیں، تفسیر مظہری کے رنگ میں ایک بھی نظر سے نہیں گزری، خصوصاً احادیث اور مذاہب اور ان کے دلائل کی تحقیق میں تو واقعی بے عدیل ہے۔

صاحب بذل المجہود حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری فرماتے ہیں:

حضرت قاضی محمد ثناء اللہ پانی کی تفسیری مظہری مسلک حنفیہ میں بے نظیر ہے، اہل علم کے لیے تو ضروری ہے، متوسط الاستعداد لوگ بھی اس کو اپنے پاس رکھیں اور عوام بھی

اس کے ترجمہ سے فائدہ اٹھائیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم تفسیر مظہری کے متعلق لکھتے ہیں:

یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لیے نہایت مفید، انہوں نے الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔ (مقدمہ معارف القرآن)

چونکہ یہ تفسیر عربی زبان میں لکھی گئی تھی، اردو دان طبقہ کے لیے اس سے استفادہ مشکل تھا، اس لیے اس بات کی بہت ضرورت تھی کہ قرآن مجید کی اس عالی شان تفسیر کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ندوۃ المصنفین دہلی کے ناظم حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی کو کہ انہوں نے نہ صرف اس تفسیر کا سلسیس اردو ترجمہ کر دیا بلکہ مفید اضافہ جات بھی درج کر دیے۔

مطبوعہ تفسیر کی چند خصوصیات: متن قرآن کریم کا مستقل اضافہ کیا گیا ہے۔ بین السطور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا ترجمہ قرآن شامل کیا گیا ہے۔ اصول وضوابط تفسیر پر شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کا ایک علمی و تحقیقی مضمون مقدمہ میں شامل ہے۔ قرآن کریم کی آیات کا حوالہ درج کیا گیا ہے۔ احادیث کی تخریج کا اہتمام کیا ہے۔

نام کتاب: ماہنامہ ندائے امت لاہور　　چیف ایڈیٹر: مولانا محمد آصف انبالوی

صفحات: ۳۰　　ناشر: ادارہ امام محمد مسجد محمدی شریف گرین ٹاؤن باگڑیاں لاہور

یہ ماہنامہ اشاعت اسلام کی سنہری کڑی ہے، جس کے اہم مقاصد درج ذیل ہیں:

قرآن پاک کی تعلیم کو عام کرنا۔ حضور ﷺ کی سیرت کو دنیا میں پھیلانا۔ اسلام پر کیے گئے مستشرقین کے اعتراضات کے علمی جوابات۔ حضور ﷺ کی سیرت کو دنیا میں پھیلانا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ہونے والے اعتراضات کے علمی جوابات۔ صحیح مسلم معاشرہ کی تشکیل وغیرہ۔